ڈاکٹر سعادت علی صدیقی

انجمن ترقی اردو ہند

غالب پر چند تحریریں

(مع حاشیۂ غالب و ترجمہ)

غالب پر چند تحریریں

(مع حبسیہ غالب و ترجمہ)

(ڈاکٹر) سعادت علی صدیقی

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

فہرست

حرفِ آغاز

سعادت علی صدیقی صاحب ممتاز ادیب، محقق، نقاد اور اردو تحریک کے سرگرم اور فعال رکن ہیں۔ وہ صرف ادب ہی کے ذریعے اردو کی خدمت نہیں کر رہے ہے بلکہ کالج میں اپنی تدریسی ذمہ داریوں کے علاوہ سنبھل کی ایک بہت بڑی لائبریری کے صدر رہیں۔ جن لوگوں کو اس لائبریری میں جانے کا اتفاق ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ سعادت صاحب کی کوششوں سے لائبریری نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اس کے علاوہ وہ مختلف ادبی تنظیموں کے سکریٹری اور پریزیڈنٹ ہیں۔ ان تنظیموں کی طرف سے وہ اردو کے جائز حقوق کے حصول کے لیے مسلسل جدو جہد کر رہے ہیں۔

"غالب پر چند تحریریں" میں غالب کے فن کے مختلف پہلوؤں پر آٹھ مضامین شامل ہیں پہلا مضمون ہی چونکا دینے والا ہے۔ اور اردو کے متنی نقادوں کے لیے خصوصی طور سے توجہ کا مستحق ہے۔ محمد حسین آزاد نے اپنے استاد ذوق کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان ایک کر دیے ہے

> "بہادر شاہ کے چار دیوان ہیں۔ پہلی کچھ غزلیں شاہ نصیر کی اصلاحی ہیں اور کچھ کاظم حسین بے قرار کی۔ غرض پہلا دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین دیوان سرتاپا حضرت مرحوم ذوق کے ہیں۔ جن سنگلاخ زمینوں میں قلم کو چلنا مشکل ہے۔ ان کا نظام اور سرانجام اس خوب صورتی سے کیا کہ دل شگفتہ ہوتے ہیں۔ والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ بادشاہ تمہارا زمین کا بادشاہ ہے۔ طرحیں خوب نکالتا ہے مگر تم سرسبز کرتے ہو۔ ورنہ شورزار بن جائے۔ مسودۂ خاص میں کوئی

شعر پورا، کوئی ڈیڑھ مصرعہ، کوئی ایک، کوئی آدھا مصرعہ، فقط بحر اور ردیف و قافیہ معلوم ہو جاتا ہے۔ باقی بخیر، ذوق ان ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھا کر حسن و عشق کی پتلیاں بنا دیتے تھے۔"

(آب حیات: ص ۶۱۳)

حق تو یہ ہے کہ جب آزاد نے ذوق کا دیوان مرتب کیا تو کلامِ ذوق میں اکثر مقامات پر نہ صرف تصرفات کیے بلکہ خاصی تعداد میں اشعار کہہ کر دیوان ذوق میں شامل کر دیے۔ حالی، غالب کے شاگرد تھے اور اس حقیقت سے انکار نہیں کہ وہ بہت ایمان دار، شریف اور نیک انسان تھے۔ لیکن اپنے استاد کے بارے میں انھوں نے بعض باتیں ایسی کہیں جو سچ نہیں ہیں۔ یہاں صرف ایک ہی بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ محمد حسین آزاد نے بہادر شاہ ظفر کا تمام شعری سرمایہ استاد ذوق کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ حالی نے ظفر کے باقی کلام کو غالب سے منسوب کر دیا۔ لکھتے ہیں:

"ناصر حسین مرزا مرحوم کہتے تھے کہ ایک روز میں اور مرزا صاحب دیوان عام میں بیٹھے تھے کہ چوب دار آیا اور کہا کہ حضور نے غزلیں مانگی ہیں۔ مرزا نے کہا ذرا ٹھہر جاؤ اور اپنے آدمی سے کہا کہ پالکی میں کچھ کاغذ رومال میں بندھے ہوئے رکھے ہیں، وہ لے آؤ۔ وہ فوراً لے آیا۔ مرزا نے اسے کھولا تو اس میں آٹھ نو پرچے، جن پر ایک ایک دو دو مصرعے لکھے ہوئے تھے، نکالے اور اسی وقت دوات قلم منگوا کر ان مصرعوں پر غزلیں لکھنی شروع کیں اور وہیں بیٹھے بیٹھے آٹھ یا نو غزلیں تمام و کمال لکھ کر چوب دار کے حوالے کیں۔"

ظفر کے بعض ناقدین، جن میں فراق، شان الحق حقی اور ڈاکٹر اسلم پرویز خاص طور پر قابل ذکر ہیں، نے مدلل طریقے سے ثابت کیا ہے کہ ظفر نہ صرف خود شاعر تھے بلکہ اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ ہاں، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ذوق اور غالب نے ان کے کلام پر اصلاح دی تھی۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ اگر محمد حسین آزاد نے ذوق کے کلام میں تصرفات کر کے بزعمِ خود اپنے استاد کے کلام پر اصلاح دی تو حالی بھی پیچھے نہیں رہے۔ انھوں نے بھی اپنے استاد

غالبؔ کے ان اشعار میں تصرفات کیے جو انھوں نے "یادگار غالب" اور "مقدمہ شعر و شاعری" میں شامل کیے تھے۔ ان تصرفات کے نفسیاتی محرکات پر گفتگو کا موقع نہیں ہے۔

سعادت علی صدیقی صاحب نے ایسے ۱۴۷ اشعار کی نشان دہی کی ہے جو "یادگار غالب" میں شامل ہیں۔ اور جن میں حالیؔ نے تصرف کیا ہے۔ اسی طرح صدیقی صاحب نے غالبؔ کے وہ آٹھ اشعار نقل کیے ہیں جو حالیؔ نے "مقدمہ شعر و شاعری" میں شامل کیے تھے۔ اور جن میں تصرف کیا ہے۔ صدیقی صاحب نے دیوان غالبؔ مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی اور دیوان غالب مرتبہ مالک رام سے ان اشعار کا موازنہ کر کے اختلاف نسخ بیان کیے ہیں۔ اگرچہ سعادت صاحب کا یہ مضمون بہت چھوٹا ہے لیکن غالبیات میں ایک اہم اضافہ ہے اور حالیؔ کی شخصیت کو سمجھنے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ یہاں میں اپنی اس کوتاہی کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ اتنی اہم حقیقت کا علم مجھے سعادت صاحب کے اس مضمون سے ہوا۔

یوں تو اس مجموعے کے تمام مضامین اہم ہیں اور بڑی محنت، تحقیق اور دیدہ ریزی سے لکھے گئے ہیں، لیکن میں اس کتاب کے ایک اور مضمون "غالب کا حادثۂ اسیری" کا خاص طور سے ذکر کروں گا۔ اس مضمون میں ۳۳ ماٰخذ کی مدد سے غالبؔ کی اسیری کے تمام واقعات اس طرح بیان کیے ہیں کہ کوئی پہلو تشنہ نہیں رہا۔ اس مضمون کے بعد "حبسیہ غالبؔ" یعنی وہ فارسی ترکیب بند نقل کیا ہے جو غالبؔ نے قید خانے میں تخلیق کیا تھا۔ فارسی ترکیب بند کے ساتھ اس کا فارسی ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔ غرض یہ ہے کہ غالبؔ پر مضامین کا یہ چھوٹا سا مجموعہ غالبیات میں ایک اہم اضافہ ہے۔

خلیق انجم

یادگارِ غالب اور مقدمہ شعر و شاعری میں غالب کے بعض اشعار

مولانا حالی، غالب کے عزیز شاگرد بھی تھے اور ان کے پہلے سوانح نگار بھی۔ ان کی کتاب "یادگارِ غالب" غالب شناسی کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے اور بعض اعتبارات سے آج بھی اس کی بے مثالی پر حرف نہیں آیا ہے۔ تشریح شعری کے فن میں اس کتاب کا وہ حصہ آج بھی پڑھنے کے قابل ہے، جس میں غالب کے اشعار کے لفظی و معنوی محاسن پر مولانا حالی نے روشنی ڈالی ہے۔
لیکن ایک عجیب بات یہ ہے اور جس کی طرف ابھی تک توجہ نہیں کی گئی ہے کہ "یادگارِ غالب" اور مقدمہ شعر و شاعری میں حالی نے غالب کے جو اشعار درج کیے ہیں، ان میں سے اکثر اشعار کا متن آج کے مصدقہ نسخوں میں موجود متن سے خاصا مختلف نظر آتا ہے۔ اگر اس پر نظر رہے کہ حالی کو کلامِ غالب کے قریبی مطالعے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ شعر انھوں نے خود غالب کی زبان سے سنے ہوں گے اور کلامِ غالب کے ان خطی اور مطبوعہ نسخوں پر بھی ان کی نظر ہو، جو اس کتاب کی تصنیف کے وقت تک منظرِ عام پر آچکے تھے تو اس اختلاف کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

متن کی ترتیب و تنقید کے جو مسائل ہیں، ان میں ایک نہایت اہم مسئلہ اختلافِ متن اور اس کے وجوہ کا تعین بھی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو "یادگارِ غالب" اور مقدمہ شعر و شاعری میں درج ایسے

مختلف المتن اشعار کی اہمیت نمایاں ہوتی ہے ۔ آزاد کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے استاد ذوق کے کلام کو جب مرتب کیا تو اس میں جگہ جگہ لفظی تصرفات کرتے گئے ۔ مثال کے طور پر یہ شعر "دیوان ذوق" مرتبہ آزاد میں اس طرح درج ہے ؎

گل بھلا کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

لیکن "دیوانِ ذوق" مرتبہ ویران وظہیر میں اس کی یہ صورت ہے ۔

کھل کے گل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اپنے مرتبہ "کلیات ذوق" میں "دیوان ذوق" مرتبہ حافظ ویران کے متن کو ترجیح دی ہے اور اس کی تہ میں غالباً یہی خیال کارفرما ہے کہ دوسری صورت آزاد کی تراشیدہ ہے ۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آزاد نے خود لفظی تبدیلی کی ہے، یا انھوں نے کبھی ذوق کی زبان سے یہ شعر اسی طرح سنا تھا، یا ان کے پیش نظر ایسی کوئی تحریر تھی، جس میں ذوق کی یہ اصلاح شدہ صورت ہو اور وہ تحریر دوسرے کے سامنے نہ ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بہرصورت ایسے عصری اختلافات ہمیشہ اہم اور قابل ذکر سمجھے جاتے ہیں ۔

کبھی کبھی سماعت یا جس چیز کو مذاق سلیم یا خوش مذاقی کہا جاتا ہے اور جو دراصل انسان کی ذاتی پسند یا ناپسند کا دوسرا نام ہے، اس کی کرشمہ کاریاں بھی ایسے اختلافات کی ذمہ دار ہوتی ہیں. مولانا حالی کو مرزا غالب سے جو ربط خاص تھا، وہ جس قدر ان سے قریب تھے اور کلام غالب سے ان کو جو تعلق خاطر تھا، ان سب کی بنا پر، ان کے درج کردہ اشعار کے متن کو بھی اہمیت حاصل ہے یہ ممکن ہے کہ ان اختلافات کو ترجیح نہ دی جا سکے اور اصل متن کا درجہ انھیں حاصل نہ ہو سکے لیکن تنقید و ترتیب، متن کے اصولوں کے تحت ان اختلافات کا تذکرہ ضروری ہوگا۔

اسی نقطہ نظر سے ذیل میں ان اختلافات کو پیش کیا جاتا ہے یادگار غالب، پہلی بار ۱۸۹۷ء میں نامی پریس کان پور سے شائع ہوئی اور "مقدمہ شعر و شاعری" ۱۸۹۳ء میں مطبع انصاری دہلی سے ۔ میں نے انھیں اوّلیں ایڈیشنوں کو بنیاد بنایا ہے اور "دیوان غالب" کے نسخہ عرشی (طبع اول ۱۹۵۸ء)

۱۸۹۷

کو پیش نظر رکھا ہے۔ مالک رام صاحب نے حال ہی میں "دیوان غالب" نسخۂ نظامی پریس کانپور کو شائع کیا ہے جو جون ۱۹۶۲ء میں غالب کی تصحیح کے بعد چھپا تھا اور جس کے متعلق مالک رام نے لکھا ہے :

"مطبع نظامی کے نسخے میں غالب کا سب سے آخری صحیح کردہ متن ہے۔ اس میں کلام بھی سب سے زیادہ ہے۔ اسی لیے یہی نسخہ غالب کی صد سالہ یادگار کے موقع پر شائع کیا جا رہا ہے۔"

اس "دیوان غالب" صدی ایڈیشن کے نسخے کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے اور اختلافات کی صورت میں نشان دہی بھی کردی ہے۔

مولانا حالی نے "مقدمۂ شعر و شاعری" میں بھی غالب کے اشعار نقل کئے ہیں۔ مضمون کے آخر میں ان اشعار کو بھی شامل کر دیا گیا ہے اور اس طرح یہ مضمون مولانا حالی کی دو تصانیف میں غالب کے اشعار کے متن اور "دیوان غالب" کے مصدقہ نسخوں کے اختلافات پر مبنی ہے یادگار غالب طبع اول کے لیے ی غ اور "دیوان غالب" نسخۂ عرشی طبع اول کے لیے ن ع کا مخفف اختیار کیا گیا ہے۔

مانا کہ نہیں آج سے اچھا کوئی دن اور	ی غ	ص ۳۷
مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا کوئی دن اور	ن ع	،، ۱۷۰
تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستد کے	ی غ	،، ۳۷
تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے	ن ع	،، ۱۷۱
ناداں ہو، جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب	ی غ	،، ۳۷
ناداں ہو، جو کہتے ہو کہ "کیوں جیتے ہیں غالب"	ن ع	،، ۱۷۱
وحشت و شیفتہ اب مرثیہ لکھیں شاید	ی غ	،، ۱۰۲
وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید	ن ع	،، ۱۸۷
شب خمار چشم ساقی رستخیز اندازہ تھا	ی غ	،، ۱۱۱
شب، خمارِ شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا	ن ع	،، ۱۴۶

گویا صحرا غبار دامنِ دیوانہ تھا	ی غ	ص ۱۱۰
تو کہے، صحرا غبار دامنِ دیوانہ تھا	ن ع	″ ۲۵
بسکہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا	ی غ	″ ۱۳۰
بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا	ن ع	″ ۱۵۰
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں	ی غ	″ ۱۳۴
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں	ن ع	″ ۱۹۲
جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے	ی غ	″ ۱۳۵
ساغرِ جم سے، مرا جام سفال اچھا ہے	ن ع	۲۳۹
ترے سروِ قامت سے اک قدِّ آدم	ی غ	۱۳۳
ترے سروِ قامت سے یک قدِّ آدم	ن ع	۱۷۹ ؁
کرنے لگا ہے باغ میں تو بے حجابیاں	ی غ	۱۳۷
کرتا ہے، بسکہ باغ میں تو، بے حجابیاں	ن ع	۲۰۶
نہ مارا جان کر بے جرم قاتل تیری گردن پر	ی غ	۱۴۰
نہ مارا جان کر بے جرم غافل تیری گردن پر	ن ع	″ ۱۴۶
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا	ی غ	″ ۱۴۰
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا	ن ع	″ ۱۶۲
غم فراق میں تکلیف سیرِ گل مت دو	ی غ	″ ۱۴۰
غم فراق میں تکلیف سیرِ باغ مت دو	ن ع	″ ۱۴۷
شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا	ی غ	۱۴۲
شایان دست و خنجرِ قاتل نہیں رہا	ن ع	۱۵۳ ؁
جہاں ساقی ہو تو دعویٰ ہے باطل ہوشیاری کا	ی غ	۱۴۲
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا	ن ع	۱۴۸
یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات	ی غ	۱۴۴
یارب وہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات	ن ع	۱۴۰

قاصد کے آتے خط اک اور لکھ رکھوں	ی غ	ص ۱۴۸
قاصد کے آتے آتے خط ایک اور لکھ رکھوں	ن ع	〃 ۱۸۸ [عہ]
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ "جاؤں کدھر کو میں"	ی غ	〃 ۱۵۰
ہر یک سے پوچھتا ہوں کہ "جاؤں کدھر کو میں"	ن ع	〃 ۱۹۰ [کہ]
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ	ی غ	〃 ۱۵۰
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ	ن ع	〃 ۱۹۰
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے	ی غ	〃 ۱۵۱
وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے	ن ع	〃 ۱۸۷
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں	ی غ	〃 ۱۵۲
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں	ن ع	〃 ۱۹۱
ہوں منحرف نہ کیوں رہ رسم صواب سے	ی غ	〃 ۱۵۳
ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسم ثواب سے	ن ع	〃 ۱۹۷
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو	ی غ	〃 ۱۵۴
لیکن، خدا کرے، وہ ترا ؟ جلوہ گاہ ہو	ن ع	〃 ۱۹۷
زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالبؔ	ی غ	〃 ۱۵۶
زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ	ن ع	〃 ۲۳۴
تم کیا گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی	ی غ	〃 ۱۵۶
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی	ن ع	〃 ۲۳۳
اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھ کو بعد قتل	ی غ	〃 ۱۵۷
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل	ن ع	〃 ۲۳۶
دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے	ی غ	〃 ۱۵۹
دل کے خوش رکھنے کو، غالب یہ خیال اچھا ہے	ن ع	۲۴۰

جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے	ی غ	ص ۱۵۹
جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے	ن ع	″ ۲۴۲
پلا دے اوک سے ساقی جو منھ (؟) سے نفرت ہے	ی غ	″ ۱۶۱
پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے	ن ع	″ ۲۴۳
ہائے واں بھی شور محشر نے نہ دم لینے دیا	ی غ	″ ۱۶۲
وائے! واں بھی شور محشر نے نہ دم لینے دیا	ن ع	″ ۱۳۲
وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جائے	ی غ	″ ۱۶۳
وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جاوے	ن ع	″ ۲۴۸
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے	ی غ	۱۶۳
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے	ن ع	ص ۲۴۹
روک دو گر غلط چلے کوئی	ی غ	
ڈھانک لو گر خطا کرے کوئی	ن ع	″ ۱۶۴
روک لو، گر غلط چلے کوئی	ی غ	
بخش دو، گر خطا کرے کوئی	ن ع	″ ۲۴۲
بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا	ی ع	″ ۱۶۴
بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا	ن ع	۲۴۹
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے مجھ کو	ی غ	″ ۱۶۶
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے، ورنہ	ن ع	″ ۲۴۵
دیا ہے اور کو بھی تا اسے نظر نہ لگے	ی غ	″ ۱۶۷
دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے	ن ع	″ ۲۳۶
زمانہ عہد میں ہے اس کے محو آرایش	ی غ	″ ۱۶۷
زمانہ عہد میں اس کے ہے محو آرایش	ن ع	″ ۲۳۶

کانوں پہ ہاتھ رکھتے ہیں کرتے ہوئے سلام	ی غ	ص ۱۷۰
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام	ن ع	〃
ہے اس سے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں	ی غ	۱۶۹〃
اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں	ن ع	
روزہ اگر نہ کھاوے، تو ناچار کیا کرے؟	ی غ	۱۷۱〃
روزہ اگر نہ کھائے، تو ناچار کیا کرے؟	ن ع	۱۳۸〃
بھیجی ہے مجھے جو شاہِ جم جاہ نے دال	ی غ	۱۷۲〃
بھیجی ہے جو، مجھ کو شاہ جم جاہ نے دال	ن ع	۲۵۳
کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر	ی غ	۱۶۸〃
کچھ تو جاڑے میں چاہئے آخر	ن ع	
جسم رکھتا ہوں، ہے اگرچہ نزار	ی غ	
تا نہ دے، باد زمہریر، آزار	ن ع	
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش؟	ن غ	
جسم رکھتا ہوں، ہے اگرچہ نزار	ن ع	
میری تنخواہ میں تہائی کا	ی غ	۱۶۹〃
میری تنخواہ میں چہارم کا	ن ع	۱۲۶〃

اسی طرح "مقدمہ شعر و شاعری" مصنفہ مولانا الطاف حسین حالی اور "دیوان غالب نسخہ عرشی میں اختلاف متن کی مثالیں ملاحظہ ہوں" "مقدمہ شعر و شاعری" کے لیے م ش اور "دیوان غالب نسخہ عرشی کے لیے ن ع کا مخفف اختیار کیا گیا ہے۔

جامِ جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے	م ش	ص ۳۹
ساغر جم سے، مرا جامِ سفال اچھا ہے	ن ع	۲۳۹〃
ان کے آنے سے جو آجاتی ہے رونق منھ پر	م ش	۴۰〃
ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے رونق منھ پر	ن ع	۲۳۹ (۵/۱۲)

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں	م ش	ص ۹۳
مشکلیں مجھ پر پڑی اتنی کہ آساں ہوگئیں	ن ع	۱۹۲
زمانہ عہد میں ہے اس کی محوِ آرائش	م ش	"
زمانہ عہد میں اس کے، ہے محوِ آرائش	ن ع	" ۲۳۶
جلاد سے لڑتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے	م ش	"
جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے	ن ع	"
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس رنگ میں جو آئے	م ش	" ۵۷
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے	ن ع	" ۲۳۹
کوئی ویرانی سے ویرانی ہے	م ش	" ۱۶۰
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے	ن ع	" ۱۵۲
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے	م ش	"
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے	ن ع	"

یہ طے کرنا ماہرین غالبیات کا کام ہے کہ حالیؔ کی تحریروں میں ملنے والے غالبؔ کے اشعار اور دیوان غالبؔ کے جدید مستند نسخوں کے اشعار کے متن میں جو اختلاف ملتا ہے، متنی نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت کیا ہے اور ان مختلف المتن اشعار میں کس کو ترجیح دی جائے۔

(غالب صدی میگزین
شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی)
(غالب نمبر ماہنامہ شاعر بمبئی)

حواشی:-

۱؎ دیوان ذوق : مرتبہ محمد حسین آزاد، طبع اول، ص : ۲۸۳

۲؎ دیوان ذوق : مرتبہ ویران، ص ۱۳۹، کلیات ذوق مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ص ۳۹۹

(اس اطلاع کے لیے میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی صاحب کا منت پذیر ہوں۔ (س ص)

۳؎ دیوان غالب : مرتبہ مالک رام (صدی ایڈیشن) ۱۹۶۹ء، ص : ۳، ۴

۴؎ ترے سرو قامت سے، اک قد آدم (دیوان غالب مرتبہ مالک رام، ص : ۸۷)

۵؎ شایان دست بازوئے قاتل نہیں رہا۔ (دیوان غالب نسخہ مالک رام، ص : ۳۹)

۶؎ قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رہوں (" " " " : ۷۸)

۷؎ ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں (" " " " : ۸۱)

۸؎ چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ (" " " " : ۸۲)

۹؎ دھوئے گئے ہم ایسے کہ، بس پاک ہو گئے " " " " :

۱۰؎ مقدمۂ شعر و شاعری : الطاف حسین حالی، مطبع انصاری دہلی، مطبوعہ ۱۸۹۳ء

۱۱؎ دیوان غالب : مرتبہ امتیاز علی عرشی، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ مطبوعہ ۱۹۵۸ء

۱۲؎ دیوان غالب : مرتبہ مالک رام، ص : ۱۳۸ میں "ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منھ پر رونق" لکھا ہے۔

غالب کا ایک شعر

اردو میں ایسے اشعار کی خاصی بڑی تعداد ہے، جن کو عام طور سے غلط پڑھا جاتا ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں، ایک تو یہ کہ بیشتر اہم شعرا، کے دواوین تحقیقی نقطۂ نظر سے مدون نہیں ہو پائے ہیں۔ کسی زمانے میں کوئی شعر جس طرح مشہور ہو جاتا ہے تو پھر عام طور سے تحریر و تقریر میں اسی طرح تکرار ہوتی رہتی ہے اور اس کی شہرت ذہن کو اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی ہے کہ مستند ماخذ سے تصحیح کر لی جائے، کبھی کبھی "خوش مذاقی" بھی دھوکا دیا کرتی ہے اور اپنی پسندیدہ صورت یا قرأت کے علاوہ واقعی صورت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہونے دیتی۔ مثال کے طور میر کا یہ معروف شعر اس طرح مشہور ہے ؎

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

حالانکہ اس کی صحیح صورت یہ ہے[1] ؎

راہ دور عشق سے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا[2]

یا ذوق کا یہ شعر ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے[3]

مولانا محمد حسین آزاد شاگرد ذوق نے اس طرح نقل کیا ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر گئے پر نہ لگا جی تو کدھر جائیں گے

مولانا حالی نے "یادگار غالب" میں اس شعر کے بارے میں یہ واقعہ لکھا ہے :

" شیخ ابراہیم ذوق جن کی نسبت مشہور ہے کہ مرزا کو ان سے چشمک تھی، ایک روز جب کہ مرزا شطرنج میں مشغول تھے منشی غلام علی خاں مرحوم نے ان کا یہ شعر، کسی دوسرے شخص کو سنانے کو پڑھا ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

خاں مرحوم کہتے ہیں کہ مرزا کے کان میں بھی اس کی بھنک پڑ گئی۔ فوراً شطرنج چھوڑ دی اور مجھ سے کہا " بھیا تم نے کیا پڑھا؟ میں نے پھر وہ شعر پڑھا۔ پوچھا کس کا شعر ہے؟" میں نے کہا ذوق کا یہ سن کر نہایت متعجب ہوئے اور مجھ سے بار بار پڑھواتے تھے اور سر دھنتے تھے، ہم بھی دیکھتے ہیں کہ مرزا نے اپنے اردو خطوں میں اس شعر کا جا بجا ذکر کیا ہے۔ جہاں عمدہ شعر کی مثالیں دی ہیں وہاں اس شعر کو ضرور لکھا ہے۔" [۵۴]

مقدمۂ شعر و شاعری میں یہ شعر اسی طرح درج کیا گیا ہے :

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے [۵۵]

ذوق مرحوم کا ایک اور مشہور شعر ہے ؎

کھل کے گل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے [۵۶]

اس کے پہلے مصرع کو کلیات ذوق مرتبہ آزاد میں یوں لکھا گیا ہے۔

گل کھلا کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے [۵۷]

مرزا غالب بھی ان اختلافات متن سے محروم نہیں رہے، ان کے متعدد اشعار "غلط خوانی" کا ہدف بنے ہیں مثال کے طور پر ان کے ایک قصیدہ کا یہ مصرع اس طرح مشہور تھا ؎

بادباں کے اٹھتے ہی لنگر کھلا

لیکن اگر دیوان غالب کے کسی مستند نسخے کو دیکھا جائے تو دوسرے مصرع کی صحیح صورت یہ ملے گی ؎

باد باں بھی، اٹھتے ہی لنگر، کھلا

یا ان کی یہ معروف غزل :

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک

غلط ردیف کے ساتھ پڑھی جاتی رہی ہے۔ یعنی "ہونے تک" حالاں کہ ہے "ہوتے تک" لیکن غالب کا مندرجہ ذیل شعر شاید سب سے زیادہ "غلط خوانی" کا نشانہ بنا ہے ؎

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

دیوان غالب نسخہ عرشی میں اس کا اہتمام کیا گیا ہے کہ کلام غالب کے قدیم اور اہم خطی نسخوں اور مطبوعہ نسخوں کے اختلاف نسخ کو یک جا کر دیا جائے۔ عرشی صاحب نے ہر شعر کے جملہ اختلاف متن کو محفوظ کر دیا ہے اور اس شعر میں کوئی اختلافِ نسخ نہیں درج کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دیوان غالب کے سارے قابل ذکر خطی اور مطبوعہ نسخوں میں دوسرا مصرعہ اس طرح درج ہے :

عرش سے اِدھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

لیکن دیوان غالب کے کئی جدید نسخوں میں دوسرے مصرع میں ادھر (بہ الف مکسور) کے بجائے اُدھر (بہ الف مضموم) چھپا ہوا ملتا ہے ان نسخوں میں "ادھر" کے الف پر خاص طور سے پیش (ـُ) لگا دیا گیا ہے مثلاً :

دیوان غالب مع شرح : از حسرت موہانی : انوار المطابع لکھنؤ : ص ۵۰
دیوان غالب مرتبہ آغا محمد طاہر دہلی : " ۲۱
دیوان غالب عکسی و پاکٹ سائز تاج کمپنی لاہور : " ۴۴

دیوان غالب عکسی (ورکلاں) سائز تاج کمپنی لاہور ص: ۴۴

اور اکثر جگہ دوسرے مصرع میں اِدھر یا اُدھر کے بجائے "پرے" بھی دیکھنے یا سننے میں آیا ہے یعنی "عرش سے پرے ہوتا کاش کے مکاں اپنا" اور اس پر غور نہیں کیا جاتا کہ "پرے" یا "اُدھر" سے شعر کا مفہوم ہی بدل جاتا ہے اور جو معنوی بلندی اس میں پنہاں ہے ختم ہو جاتی ہے۔ مولانا امتیاز علی عرشی نے اپنے مقدمہ دیوان غالب میں خاص طور سے اس شعر کے اس پہلو کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے۔

"مرزا صاحب کے زمانے میں، بلکہ ان کے بہت بعد تک "اس" اور "ادھر" وغیرہ الفاظ کو باقاعدہ اعراب بالمعروف "اوس" اور "اودھر" لکھا جاتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس کا التزام رکھا تھا۔ میں نے واؤ گرا کر اس کی جگہ پیش (ـُ) کا التزام کیا ہے لہذا جس الف کو آپ مضموم نہ پائیں اسے یہ سمجھیں کہ مرزا صاحب نے اسے بے واؤ کے ہی لکھا ہے اگر ایسا نہ کیا اور اپنی طرف سے اسے مضموم قرار دے لیا تو یہ ان کی منشا مراد کے خلاف ہو جائے گا اور آپ بھی شاعر کے کلام کی وہ تاویل کر بیٹھیں گے جو اسے منظور نہ تھی۔ جیسا کہ اس شعر میں واقع لفظ "اِدھر" کو "اُدھر" پڑھ کر اس کا ایک مطلب بیان کیا جاتا ہے ؎

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اِدھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

چونکہ مرزا صاحب کی زندگی کے تمام قلمی و مطبوعہ نسخوں میں اس شعر کے اندر "اِدھر" بے واؤ ہے کسی ایک جگہ بھی "اودھر" بواؤ نہیں اس لیے اس لفظ کو ادھر پڑھنے والے کا مطلب قابل قبول نہیں ہو سکتا۔" ۱۱

دیوان غالب مرتبہ مالک رام میں اس شعر کا دوسرا مصرعہ اسی طرح درج ہے "عرش سے ادھر ہوتا کاش کے مکاں اپنا" لیکن حاشیہ میں اختلاف نسخ کے تحت بغیر حوالے کے "پرے" لکھ دیا ہے۔ مقدمہ میں اس کی صراحت کر دی گئی ہے کہ دو حواشی میں بغیر حوالہ میں اختلافات کو درج کیا گیا ہے ان کا مطلب یہ ہے کہ یہ عام مطبوعہ نسخوں میں پائے جاتے ہیں۔

دیوان غالب حمیدیہ (مطبوعہ) میں بھی " پرے" لکھا ملتا ہے لیکن یہ عام مطبوعہ نسخوں کی نقل ہی ہے۔[۱۱] مالک رام نے مقدمہ میں اس کے متعلق لکھا ہے۔

"نسخہ حمیدیہ کے مرتب نے جب مطبوعہ کلام اپنے ہاں شامل کیا تو ان اغلاط کو جوں کا توں لے لیا اور ان کی درستی کے لیے کوشش نہیں کی۔ اس لحاظ سے نسخہ حمیدیہ جامع الاختلاف بلکہ جامع الاغلاط کہلانے کا مستحق ہے۔"[۱۲]

یہی رائے عرشی صاحب کی بھی ہے۔

"مفتی صاحب نے یہ کام بڑی محنت سے انجام دیا ہے مگر وہ اس زمانے میں محکمہ تعلیم کے افسر بھی تھے جس کے باعث تصحیح کا حق ادا نہ کر سکے اور اس میں ہر طرح کی غلطیاں راہ پا گئیں۔"[۱۳]

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ دیوان متن کے لحاظ سے مستند نہیں ہے اور "پرے" کے حق میں نسخہ حمیدیہ کو مستند نہیں مانا جا سکتا۔

دیوان غالب نسخہ عرشی کے بعد امید کی جاتی تھی کہ غالب کے اشعار خواص کی حد تک "غلط خوانی" سے ضرور محفوظ ہو جائیں گے اور خواہ عوام اپنی وضع داری پر قائم رہیں لیکن ارباب فہم وذکا اس غلط العام بلکہ غلط العوام سے ضرور دامن کش رہیں گے۔ لیکن تعجب وحیرت کی بات یہ ہے کہ یہ شعر اب بھی اسی پرانے غلط متن کے ساتھ دیکھنے میں آتا ہے بلکہ اکثر ایک اور غلطی کے اضافے کے ساتھ۔

غالب کی سو سالہ یادگار کے موقع پر حکومت پاکستان نے دو یادگاری ٹکٹ جاری کیے ہیں اس میں ایک ٹکٹ پر غالب کی تصویر کے ساتھ، ان کا یہ شعر بھی اس طرح شائع کیا گیا ہے:

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

ڈاک ٹکٹ کی حیثیت دستاویز کی سی ہوتی ہے اور اس میں اس کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ وہ امکانی حد تک بالکل صحیح نقوش سے مزین ہو۔ یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ اس

ٹکٹ پر ثبت اس شعر میں دو فاش غلطیاں موجود ہیں ایک صحت متن کے لحاظ سے اور دوسری صحت املا کے لحاظ سے۔ صحت متن کے لحاظ سے دوسرے مصرع میں "پرے" کی جگہ "ادھر" بہ الف مکسور ہونا چاہیے۔ عرشی صاحب کی رائے اوپر نقل کی جا چکی ہے۔ دیوان غالب کے صاحب نظر شارحین نے بھی عرش سے ادھر مکاں ہونا مراد لیا ہے۔ مثلاً مولانا نظم طباطبائی نے لکھا ہے:

"یعنی کاش کہ ہمارا مکان عرش سے اس طرف ہوتا تاکہ ہم عرش پر منظر بنا کر اپنے مقام کو دیکھ سکتے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے مکان سے بلند کوئی جگہ ہے ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی حقیقت یا ماہیت سے بے خبر ہیں۔" [۱۴]

دوسری غلطی یہ ہے کہ "کاشکے" کو "کاش کہ" لکھا گیا ہے فارسی اور اردو میں اب اس کا مسلّمہ املا "کاشکے" ہے۔ صاحب برہان قاطع نے خاص طور سے اس کی صراحت کر دی ہے کہ اس لفظ کے آخر میں "ے" ہے:

"با کاف تحتانی رسیدہ کلمۂ تمنّیٰ است کہ آرزو باشد و بمعنی تاسف و افسوس و حیرت ہم آمدہ است۔" [۱۵]

"نور اللغات" اور "فرہنگ آصفیہ" میں بھی اس کی صرف یہی صورت (کاشکے) درج ہے۔ صاحب "غیاث اللغات" نے ٹیک چند بہار کے رسالے "جواہر الحروف" کے حوالے سے لکھا ہے کہ اصلاً یہ "کاش کہ" تھا۔ لیکن اب "کاشکے" ہی لکھا جاتا ہے:

"کاشکی، کلمۂ تمنا کہ در اصل "کاش کہ" بود ہائے مختفی کہ در آخر کاف بیانی بود بسبب کسر کاف بیانی تحتانی بدل کردہ "کاشکے" می نویسند"

غرض کہ اب فارسی اور اردو میں اس لفظ کا صحیح املا "کاشکے" ہے "کاش کہ" نہیں۔ لیکن دیوان غالب کے بعض نسخوں میں اب بھی "کاش کہ" چھپا ملتا ہے۔ مثلاً تاج کمپنی لاہور کے دونوں نسخوں میں "کاش کہ" چھپا ہوا ہے۔ لیکن اس کی حیثیت "غلط الکاتب" کی ہے اور کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہے۔ یہاں اس طرف بھی اشارہ کرنا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ سردار جعفری نے دیوانِ غالب کا جو نسخہ اردو، ہندی رسم الخط میں ٹائپ میں کرایا ہے (شائع کردہ ہندوستانی بک ٹرسٹ بمبئی) اس میں اس لفظ کے املا میں ایک اور جدت ملتی ہے۔ اس میں "کاش" اور "کے" کو الگ الگ

لکھا گیا ہے یعنی "کاش کے مکاں اپنا"۔ یہ املا بھی ناقابل قبول ہے۔ "کاشکے" ایک مفرد لفظ ہے اور اس کے ٹکڑے نہیں کیے جا سکتے۔ غالب کی وہ مشہور فارسی غزل جس کا مطلع ہے۔

نا فصلِ از حقیقتِ اشیا نوشتہ ایم
آفاق را مرادفِ عنقا نوشتہ ایم

اسی غزل کا ایک شعر ہے:

آئندہ و گزشتہ تمنا و حسرت است
یک کاشکی بود کہ بصد جا نوشتہ ایم

یہاں اگر "یک کاشکی" کو "یک کاش کے" یا "یک کاش کی" لکھا جائے تو نگاہوں کو خود بخود لفظاً عدم تناسب کا احساس ہوگا۔

اسی قبیل کا ایک اور لفظ "کیونکے" بمعنی "کیوں کر" ہے جس کو بہت سے لوگ ناواقفیت یا غلط فہمی کی بنا پر "کیونکہ" لکھ دیا کرتے ہیں جیسے "کاشکے" کو "کاش کہ" اور یہ امتیاز نہیں کیا جاتا کہ "کیونکہ" اور "کیونکے" معناً مختلف ہیں اور کیونکہ یائے مجہول "کیونکہ" سے بنا ہے۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے لکھا ہے:

ایک لفظ تھا "کیونکر"، "کر" کا بدل ہے "کے"، اس لیے "کیوں کر" کا بدل ہوا "کیوں کے"، بالکل اسی طرح جیسے "آکر، جاکر، کرکر" کی جگہ "آکے، جاکے، کرکے"، بھی بولتے ہیں۔ پرانے زمانے میں "کیونکے" لکھتے تھے۔ ایک دوسرا تھا "کیونکہ" (جس کا پہلا ٹکڑا ہندی دوسرا فارسی ہے) اس کا بدل ہے "کس لیے کہ" یا "اس لیے کہ"۔ بھلا فارسی "کہ"، کو ہندی "کے" سے جو "کر" کا قائم مقام ہے، کیا واسطہ ہے؟ اگر اصرار ہے کہ "کیونکے" غلط ہے "کیونکہ" لکھو۔ اگر کوئی کہے یہ لفظ اب نہیں بولا جاتا تو یہ دعویٰ بھی غلط ہے۔ دلی والے آج بھی بولتے ہیں اور اس کی صحیح کتابت "کیونکے" (یا کیوں کے) ہے۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

نہ جانے کیوں کہ مٹے داغِ طعن بدعہدی
تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے[۶]

اس ٹکٹ کے داہنی طرف غالب کی ایک تصویر بھی چھاپی گئی ہے اور غضب کی بات یہ ہے کہ یہ وہی تصویر ہے جس کے متعلق سب کو علم ہے کہ جرمنی میں کسی مصور سے تیار کرائی گئی تھی اور جسے تاج کمپنی نے اپنے مرصع عکسی دیوان غالب میں شامل کر کے ازسرِنو شہرت بخشی تھی۔ اب جب کہ غالب کی کئی ایسی تصویریں سامنے آچکی ہیں[۷] جن کے متعلق محققین شبہ کا اظہار نہیں کرتے، یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ایک ایسی تصویر کو ڈاک پر ثبت کیا جائے جس کا مصنوعی ہونا مسلّم ہو۔ ڈاک کا ٹکٹ دستاویزی حیثیت رکھتا ہے اور دستاویز کو مصنوعی عناصر سے لازماً پاک ہونا چاہیے۔ یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ ارباب کار کو اس کا علم نہیں ہوگا۔

(غالب صدی نمبر ماہنامہ سب رس حیدرآباد)

حواشی :-

[۱] کلیات میر کے مرتب مولانا عبدالباری آسی لکھنوی نے اس شعر کے متعلق حاشیے میں اس کی مزید صراحت کردی ہے کہ یہ شعر اس طرح بھی مشہور ہے "ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا" الخ مگر صحیح اس طرح ہے جیسا کہ نقل کیا گیا ہے (کلیات میر مرتبہ عبدالباری آسی: ص ۲۹)

[۲] کلیات میر مرتبہ عبدالباری آسی (نول کشور ایڈیشن: ص ۲۹)

[۳] "کلیات ذوق" مرتبہ حافظ ویران: ص ۱۳۹ و کلیات ذوق مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی: ص ۴۴۷

[۴] "کلیات ذوق"، مرتبہ محمد حسین آزاد طبع اول: ص ۲۳۸

[۵] "یادگار غالب"، مولانا الطاف حسین حالی، طبع اول ۱۸۹۷ء، طبع اول نامی پریس کانپور: ص ۸۳، ۸۲

[۶] مقدمۂ شعر و شاعری"، مولانا الطاف حسین حالی، طبع اول ۱۸۹۳ء، مطبع انصاری دہلی: ص ۱۷

ے "کلیات ذوق"، مرتبہ حافظ ویراں: ص ۱۳۹۔ کلیات ذوق مرتبہ تنویر علوی : ص ۳۹۹

شہ کلیات ذوق ، مرتبہ محمد حسین آزاد : طبع اول ، ص ۲۸۳

۹ اب یہ بات متحقق ہو چکی ہے کہ اس غزل کی ردیف" ہوتے تک" ہے (ملاحظہ ہو دیوان غالب نسخہ عرشی ص ۱۹۵۔ دیوان غالب نسخہ مالک رام) لیکن ابھی پروفیسر محمد مجیب صاحب کا جو بیحد دیدہ زیب انتخاب کلام" غالب اردو کلام کا انتخاب" کے نام سے چھپا ہے اس میں اس غلط مشہور " ہونے تک" لکھا گیا ہے۔ (غالب اردو کلام کا انتخاب ص ۱) یہاں خوش مذاقی نے اپنا کرشمہ دکھایا ہے کیونکہ بعض لوگوں کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ" ہوتے تک" کانوں کو بھلا نہیں معلوم ہوتا۔ (س ج)

نلہ مرزا غالب اردو : مرتبہ امتیاز علی عرشی (طبع ۱۹۵۷) ص ۱۱۸

لله دیوان غالب جدید ، مرتبہ محمد انوار الحق ، ص ۴۹

للہ دیوان غالب : مرتبہ مالک رام، آزاد کتاب گھر دہلی، ص ۳۳

سله دیوان غالب اردو : مرتبہ عرشی، ص ۱۱۲

کله شرح دیوان غالب : نظم طباطبائی، مطبوعہ حیدر آباد دکن ، ص ۴۰

ھلہ برہان قاطع : مطبع نول کشور لکھنؤ ، ص ۲۳۶

لله دلی کی زبان : ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (کلیات ولی، مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، ص ۳۵)

کلہ غالب کی تصویر کے لیے دیکھئے مختار الدین کا مضمون" غالب کی تصویریں" (احوال غالب: ڈاکٹر مختار الدین احمد)

یادگار غالب کے قیام کی اولین کوشش

۱۹۶۹ء میں مرزا غالب کی صد سالہ یادگار تزک واحتشام کے ساتھ منائی گئی ہے اس سلسلے میں بہت سے جلسے ہوئے، مشاعرے کیے گئے ۔ بین اقوامی سیمینار منعقد ہوا اور نہ معلوم کیا کیا ہوا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ برسوں کی تیاری، اہتمام اور شور وفغاں کے باوجود غالب کے اردو اور فارسی کلام کا کوئی مستند اور مکمل ایڈیشن شائع نہیں کیا جا سکا۔ حد یہ ہے کہ جس نثر نگاری کی بنا پر غالب کو ایک نئے دور کا بانی اور ایک نئے انداز کا موجد کہا جاتا ہے اور ان کے جن مکاتیب کو اردو نثر کی آبرو بتایا جاتا ہے ان کا بھی کوئی مجموعہ سامنے نہیں آسکا۔ ع

ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے

لیکن اس وقت میں اس تلخ نوائی سے قطع نظر کر کے ایک اور اہم بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے یا محسوس کرایا جا رہا ہے کہ جیسے غالب کی یادگار قائم کرنے کا خیال بس اس زمانے میں کچھ درد مند دلوں میں پیدا ہوا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ گویا اسی زمانے میں غالب کی عظمت اور ان کے کمالات کی گراں مائگی کا صحیح احساس پیدا ہوا ہے اور اس سے پہلے خواہ غالب کی شہرت کتنی ہی رہی ہو ان کی یادگار قائم کرنے اور اس کے متعلق دوسری باتوں کو بروئے کار لانے کا احساس دلوں میں نہیں تھا۔ اس احساس کو زیادہ تقویت اس بات سے ہوئی کہ جن حضرات نے اس زمانے میں یادگاریں قائم کرنے اور یادگاریں منانے میں اہم حصہ

لیا ہے۔ انھوں نے بھی کچھ اس طرح کا انداز اختیار کیا ہے جیسے برسوں کے بعد پہلی بار یہ خیال دلوں میں پیدا ہو گیا ہے گویا یہ وہ مضمون ہے جو غیب سے خیال میں آیا ہے۔

حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ کے انتقال کے بعد ہی دردمند دلوں میں یہ احساس جاگ اٹھا تھا کہ غالبؔ کے شایانِ شان ان کی یادگار قائم ہونا چاہیے اور یہ صرف ایک مبہم خیال نہیں تھا۔ پیش کرنے والوں نے اس کو وضاحت اور صراحت کے ساتھ پیش کیا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس خیال کو پیش کرنے والوں کے ذہنوں میں حقیقی مفہوم تھا۔ وہ یادگار قائم کرنے والوں کی شہرت کے بجائے اس یادگار کی پائداری، پرکاری اور اس کے شایانِ شان ہونے کی ضرورت پر زور دینا چاہتے تھے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اس یادگار کو سراسر ادبی حدود کے اندر محدود رکھنا چاہتے تھے۔ ان لوگوں کی خواہشوں اور کاوشوں کا سرے سے ذکر ہی نہ کیا جانا اور یادگار کے قیام کو موجودہ زمانے کے چند حضرات ہی کے دلِ دردمند کی تمنا قرار دینا ان لوگوں سے سخت ناانصافی ہے۔

یادگارِ غالبؔ کے سلسلے میں جو اولین کوششیں کی گئی تھیں ان سب میں ایک بات مشترک پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان لوگوں کی تجویزوں میں خود نمائی اور خود فروشی کا شائبہ نہیں پایا جاتا۔ ان کا مقصد محض یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلوص کے ساتھ کچھ کیا جائے۔ اس زمانے میں جو کچھ کیا گیا اور کیا جا رہا ہے اگر ان اولیں تجاویز کا ان سے مقابلہ کیا جائے تو عشق و ہوس کا امتیاز صاف نظر آ جائے گا۔

یادگار کے قیام کے سلسلے میں جو اولین کوششیں ہوئیں ان کا مطالعہ کرنے والوں کے سامنے ایک اور دلچسپ پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں خانوادۂ غالبؔ کا عجیب انداز رہا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ آخر کار دہلی کی سرزمین ہی غالبؔ کا وطن بن چکی تھی۔ وہ پیدا یہاں نہیں ہوئے لیکن ساری عمر یہیں رہے اور دفن بھی یہیں ہوئے اسی کو انھوں نے اپنا وطن سمجھا اور یہیں کے عمائدین ان کے حریف بھی تھے اور رفیق بھی۔ دہلی کے خاندانوں سے ان کی قرابت تھی اور وہ عمر بھر انھیں گھرانوں کے افراد کو اپنا سب کچھ سمجھتے رہے۔

نیر ہوں کہ علائی، سالک ہوں کہ کامل، اسی سرزمین کے لوگ ان کی آنکھوں کی روشنی

تھے اور ان کے عزیزانہ تعلقات کا دائرہ دہلی ہی تک محدود تھا۔ اس اعتبار سے ہونا یہ چاہیے تھا کہ سب سے پہلے ان کے متعلقین خاص طور سے اس کام کی طرف توجہ کرتے لیکن ان عزیزوں میں سے کسی ایک فرد کا نام کسی تجویز یا کام کے ساتھ نظر نہیں آتا اور ایک مثال اس کی نہیں ملتی کہ ان کے خاندانی عزیزوں میں سے دور یا پاس کے کسی فرد کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا ہو البتہ اس کے خلاف ثبوت ضرور ملتا ہے کہ جب بعض لوگوں نے یادگار قائم کرنے کا کچھ کام کرنا چاہا تو عزیزوں میں سے ہی بعض حضرات نے اس کی مخالفت کی۔ اور اس وقت ان کو اچانک یہ خیال آیا کہ ان کے ہوتے ان کے جلیل القدر بزرگ کی قبر کی مرمت عوام کے چندے سے ہو حالاں کہ اس سے پہلے بھی یہ لوگ موجود تھے۔ اور اس کے بعد بھی زندہ رہے۔ کہنے کی بات نہیں لیکن کہے بغیر بھی نہیں رہا جاتا کہ غالبؔ کے اعزّا کا یہ طرزِ عمل کچھ نیا نہیں تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے غالبؔ کے حادثۂ اسیری کا ذکر کرتے ہوئے "اقربا کی بے صبری" کے عنوان سے لکھا ہے:

"اس سلسلے میں واقعے کا ایک پہلو نہایت عبرت انگیز ہے۔ جن کی تفصیلات مجھے خواجہ حالی سے معلوم ہوئیں۔ جوں ہی میرزا گرفتار ہوئے اور رہائی کی طرف سے مایوسی ہوگئی نہ صرف دوستوں اور ہم جلیسوں نے بلکہ عزیزوں نے بھی یک قلم آنکھیں پھیر لیں اور اس بات میں شرمندگی محسوس کرنے لگے کہ میرزا کے عزیز و اقارب تصور کیے جائیں۔

اس باب میں خاندان لوہارو کا جو طرزِ عمل رہا وہ نہایت افسوس ناک تھا۔ میں نے نواب امیرالدین مرحوم سے اشارتاً تذکرہ کر کے ٹٹولنا چاہا ان کے جوابات سے بھی اس کی پوری تصدیق ہوگئی۔

اس خاندان کا کوئی فرد نہ تو اس زمانے میں میرزا سے ملا اور نہ کسی طرح کی اعانت کی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جب آگرے کے ایک اخبار نے میرزا کا ذکر کرتے ہوئے خاندان لوہارو کا رشتہ ظاہر کیا تو یہ بات ان لوگوں پر نہایت شاق گزری اور بہ اہتمام و تکلف اس کی تغلیط کرائی یہ لکھا یا کہ میرزا صاحب اور خاندان لوہارو کا کوئی نسبی

تعلق نہیں ہے محض دور کا سطحی تعلق ہے۔

نواب ضیاءالدین پر میرزا کو جس درجہ ناز تھا وہ ان کے قصیدے سے ظاہر ہے لیکن نہایت افسوس کے ساتھ یہ واقعہ لکھنا پڑتا ہے کہ انھوں نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ اور اسے کسر شان سمجھے کہ ایک اسیر جرم سے ملنے جائیں۔"

یادگار غالب کے قیام کے سلسلے میں سب سے پہلی تجویز جس کا ہم کو علم ہے غالب کے شاگرد محمد مردان علی خاں رعنا کی تھی۔ یہ تجویز "اودھ اخبار" لکھنؤ کے شمارہ ۲۳ مارچ ۱۸۶۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس تجویز کا سب سے اہم اور سب سے زیادہ قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ اس میں ایک "میموریل والیوم" کا تصور پیش کیا گیا ہے جو غالباً اس وقت تک بالکل نئی چیز تھی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ:

"یہ یادگار خالص ادبی یعنی ایک کتاب کی صورت میں ہو تو بہتر ہے۔" اور اس کے لیے ان کی تجویز یہ تھی کہ اس کتاب کے دو حصے ہوں۔ ایک حصے میں "ان تاریخی واقعات کو اردو فارسی میں مرتب کیا جائے جن کا ان کی ذات سے گہرا تعلق ہے اور دوسرے حصے میں ان نظموں اور مضامین کو جمع کر دیا جائے جو ان کے شاگردوں نے لکھے ہیں۔ ان کے شاگردوں کا بھی مختصر تذکرہ ہونا چاہیے۔" اور اس بات پر خاص زور دیا ہے کہ "لیکن یہ تمام نثری اور منظوم تحریریں صرف غالب کے شاگردوں کی ہونی چاہئیں۔"

آپ نے دیکھا کہ رعنا سب سے زیادہ زور اس بات پر دیتے ہیں کہ یہ یادگار "خالص ادبی" ہونا چاہیے اور مجھے کہنے دیجیے کہ رعنا کی یہ خواہش ہنوز تشنۂ تکمیل ہے۔ سارے ہنگامے اور شور و شغف کے باوجود نہ تو ہم غالب پر کوئی ایسی کتاب شائع کر سکے ہیں جو ان کے حالات اور ان کے عہد کی مکمل دستاویز ہو اور نہ ہی ان کے کلام کا کوئی مستند اور مکمل نسخہ شائع کر سکے ہیں ہاں "خالص غیر ادبی" ہنگاموں کا طوفان زمین سے آسمان تک نظر آتا ہے۔

ذیل میں محمد مردان علی خاں رعنا شاگرد مرزا غالب کی تجویز مکمل نقل کی جاتی ہے:

"یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندستانی شعرا میں غالب مرحوم خاتم الشعرا تھے۔ اور ان کے بعد حقیقی شاعری کا وہ رنگ باقی نہ رہا۔ ایک ایسے استاد کے لیے جس نے اپنی ذہانت سے ہندوستانی پر جادو کا اثر دکھایا ہو ضروری ہے کہ ایک ایسی

یادگار قائم کی جائے جو ان کے شایانِ شان ہو۔ اس میں جو لوگ ہاتھ بٹا سکتے ہیں وہ ان کے تلامذہ ہیں۔ اس لیے میں گزارش کرتا ہوں کہ وہ فرماں بردار شاگردوں کی طرح صمیم قلب سے اس خیال کو جلد سے جلد عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں میری ناچیز رائے میں دہلی کے مخصوص حضرات کو ایک انجمن کی تشکیل کرنی چاہیے۔

یہ انجمن اس تجویز کو غور و فکر کے بعد منظور کرے اور تخمینہ میں پیش کرے کہ اس یادگار کے قائم کرنے میں کیا خرچ آئے گا۔ پھر اس خرچ کو پورا کرنے کے لیے چندہ جمع کرنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن میرے خیال میں یہ یادگار خالص ادبی یعنی ایک کتاب کی صورت میں ہو تو بہتر ہے جس کے پہلے حصے میں ان تاریخی واقعات کو اردو فارسی میں مرتب کیا جائے جن کا ان کی ذات سے گہرا تعلق ہے اور جو دوسروں کے لیے دلچسپی کا سبب بنیں۔ دوسرے حصے میں ان نظموں اور مضامین کو جمع کر دیا جائے جو ان کے شاگردوں نے لکھے ہیں۔ اس کے بعد ان قطعات تاریخ اور مرثیوں کو مرتب کیا جائے جو ان کے شاگردوں نے ان کی وفات پر کہے ہیں اس کتاب میں ان کے شاگردوں کا مختصر تذکرہ بھی ہونا چاہیے لیکن یہ تمام نثری اور منظوم تحریریں صرف غالب کے شاگردوں کی ہونی چاہئیں۔ اس کتاب کو دو حصوں میں اردو اور فارسی پر مشتمل ہونا چاہیے۔ اس کے باوجود اگر کوئی ارادتمند مرحوم کے متعلق کوئی چیز بھیجتا ہے تو اسے بھی کتاب کے خاتمے میں شامل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کتاب میں غالب کی تصویر کے ساتھ ان کے شاگردوں کی مکمل فہرست ہونا بھی ضروری ہے۔ ہر شاگرد اور چندہ دینے والے کو اس کتاب کا ایک نسخہ ملنا چاہیے پھر جو کتابیں بچیں وہ فروخت کر دی جائیں۔

اگر میری اس تجویز پر عمل کیا گیا تو غالب کے شاگرد اپنے لائق استاد کو کھلے بندوں خراج عقیدت پیش کرنے کا حق ادا کریں گے اور یہ اہم ادبی یادگار غالب کے ساتھ ہمیشہ رہے گی۔

اگر یہ انجمن میری تجویز کے علاوہ اس شاعر کی یادگار قائم کرنے کی کوئی صورت

پیدا کرے تو وہ اور بہتر بات ہوگی"۔ ۳۵

جنوری ۱۹۰۷ء میں سرشیخ عبدالقادر نے "مخزن" میں اس طرف توجہ دلائی کہ مزار غالب کی از سر نو تعمیر کی جائے۔ دو مہینے بعد ہی "مخزن" لاہور ہی میں ایک مراسلہ نگار نے مزار غالب کی زبوں حالی کا ذکر کر کے اس کی مرمت کی فوری ضرورت پر زور دیا ہے اور اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ اگر مرمت فوری نہ کرائی گئی تو رفتہ رفتہ حالت ابتر ہوتی جائے گی۔ مراسلہ نگار نے لکھا ہے کہ۔

"مزار غالب کی عین قبر پر پاس والے احاطے کی دیوار تھوڑے دن ہوئے گر پڑی ہے اور قبر تمام اس کے نیچے دب گئی ہے۔ لوح مزار کو جس پر مجروح مرحوم کی کہی ہوئی تاریخ کندہ ہے تعجب کی بات ہے کہ کوئی صدمہ نہیں پہنچا ورنہ یہ پتھر سنگ سفید بہت پتلا ہے اگر دیوار کا کوئی پتھر اس پر آکر پڑتا تو یہ ضرور ٹوٹ جاتا۔ اس قبر کو اوپر سے صاف کروا کے دوبارہ احاطے کی دیوار کو بنوا دینا بہت ضروری ہے ورنہ رفتہ رفتہ حالت ابتر ہوتی جائے گی"۔ ۳۶

مردان علی رعنا نے انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں غالب کی یادگار کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا تصور پیش کیا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز ہی سے ان کے مزار کی خستہ حالی کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ غالب کی عظمت کا نقش دلوں پر کس قدر گہرا تھا اس زمانے میں اہم اشخاص مزار غالب کی مرمت کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ دراصل یہ ایک طرح سے اعتراف تھا اس عدیم المثال شاعر کے کمالات کا اور اظہار تھا پر خلوص اعتراف کا۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے زیادہ پر جوش کوشش مولانا محمد علی جوہر نے کی تھی۔ مرحوم کو زیادہ غیرت اس پر آئی کہ ایک انگریز ڈاکٹر مارس نے پانیر میں ایک مراسلہ لکھا تھا جس میں مزار غالب کی کس مپرسی کی طرف توجہ دلائی گئی تھی۔ مولانا محمد علی نے اس مراسلہ کے جواب دیتے ہوئے اپنے انگریزی اخبار ہفتہ وار "کامریڈ" میں ایک پر زور مضمون لکھا تھا جس میں نہایت دل سوزی کے ساتھ مزار غالب کی المناک حالت کا ذکر کیا تھا اور نہایت دردمندانہ اظہار حسرت کیا تھا کہ غالب جیسے شاعر کا مزار اس حالت میں ہے۔

مولانا محمد علی مرحوم نے صرف مزار غالب کی مرمت کا ذکر ہی نہیں کیا تھا بلکہ انھوں نے ذرج ذیل تجویز کی طرف توجہ بھی دلائی تھی۔

۱۔ غالب کی کوئی عمدہ سوانح حیات مرتب نہیں ہوئی ہے اور غالب کی نظم ونثر کا بھی کوئی اچھا ایڈیشن موجود نہیں۔

۲۔ ہمارے ملک میں غالب سوسائٹی کا وجود نہیں۔

۳۔ نہ کہیں کوئی غالب لکچر رشپ ہے۔

مولانا مرحوم زندہ ہوتے تو ان کا یہ حسرت آج بھی داد طلب ہے اور ان کا یہ خواب ہنوز شرمندۂ تعبیر ہے۔ یہ تجویز ۱۹۱۱ء میں پیش کی گئی تھی اور یہ ۱۹۷۱ء ہے اور ہم نے ابھی غالب صدی کی ہنگامہ آفریں یاد منانے سے فرصت پائی ہے لیکن آج بھی ہندوستان کی کسی یونیورسٹی میں اس سوسالہ یادگار کے سلسلے میں کوئی "غالب چیئر" قائم نہیں ہو سکی ہے۔

فریاد از درازیٔ خواب گرانِ ما

اور یہ کیسے قلق کی بات ہے کہ ساری یادگاریں منائی گئیں اور اگر کسی دوسرے ملک کا کوئی ادب دوست کسی ہندوستانی سے یہ پوچھے کہ جناب غالب کے اردو خطوں کی بڑی دھوم سنی ہے، کیا ایسا کوئی مجموعہ ہے جس میں ان کے سارے خط سلیقے سے مرتب کیے ہوئے ہوں یک جا مل جائیں، یا ان کے خطوط کا کوئی عمدہ انتخاب چھاپا گیا ہے یا وہ یہ پوچھے کہ غالب کی شاعری کی داستانیں مشہور ہیں کیا ان کے اردو فارسی کلام کا کوئی مکمل اور مستند مجموعہ چھاپا گیا ہے تو اس کے سوا کہ شرم سے گردن جھک جائے۔ اور پیشانی عرق انفعال سے تر ہو جائے اور کچھ نہیں بن پڑے گا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ہم ٹھوس کاموں سے زیادہ نمائش اور ہنگامہ آرائی پر مٹے پڑے ہیں اور اسی کو حاصل سمجھتے ہیں۔ عرفی نے شاید اس موقع کے لیے کہا تھا۔

بخوں آلودہ دست و تیغ غازی ماندہ بے تحسیں
تو اول زیب اسپ و زینت برگستواں بینی

ذیل میں مولانا محمد علی مرحوم کے اس اہم اور پر جوش مضمون کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے جو انھوں نے اپنے ہفتہ وار اخبار "کامریڈ" میں لکھا تھا:

"غالب کا مزار کس مپرسی کی حالت میں ہے اس کے بارے میں جناب ڈاکٹر مارٹن صاحب نے روزنامہ "پانیر" میں ایک مراسلہ شائع کرا کر اردو فارسی ادب کے شیدائیوں پر احسان

کیا ہے۔

ہمیں پہلی بار اس بات کا علم ہوا کہ مرزا نوشہ کا مزار حضرت نظام الدینؒ دہلی میں حضرت سلطان جی کے احاطے کے باہر واقع ہے۔ اس کے چاروں طرف ایک دیوار ہے جو اتنی خستہ ہے کہ اس کے ملبے نے لال پتھر والے تختہ کو ڈھک لیا ہے۔ لوح سنگِ مرمر کی ہے جس پر ایک شعر کندہ ہے۔ خطرہ ہے کہ کہیں وہ بھی اسی ملبے میں دب نہ جائے۔ بارش ہو جانے کے بعد اس کا ملنا محال ہے۔ ڈاکٹر مارٹن نے صحیح لکھا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو اس خطّے سے اردو ادب کی ایک اور نمایاں یادگار معدوم ہو جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ تجویز نہایت معقول ہے کہ مزار کے اوپر ایک مناسب میموریل کی تعمیر کے لیے چندہ فراہم کیا جائے۔ اگر دہلی اور اس کے اطراف میں اس کام کا بیڑا اٹھانے پر کوئی تیار نہیں تو ہم اس فریضہ کو اپنے سر لیتے ہیں۔ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ادبی شعبے کو جس کے سکریٹری اس وقت جناب عزیز مرزا صاحب ہیں اس امر کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ جناب حامد علی خاں صاحب روزنامہ پانیر کے ذریعہ یہ اطلاع دیتے ہیں کہ میری خدمات جس لائق ہوں حاضر ہیں۔" وہ لکھتے ہیں کہ کئی سال بیتے میں نے اس مزار کی زیارت کی تھی، انھوں نے حضرت مجروح کی لکھی ہوئی تاریخ وفات کا مترجم حوالہ بھی دیا ہے ہمارا خیال ہے کہ جب انھوں نے قبر کی زیارت کی تھی تب وہ اتنی خستہ حالت میں نہ ہو گی جتنی آج ہے۔ ورنہ اس وقت ان کی پیش کش کوئی معنی نہ رکھتی۔ بےچارہ غالب ایسا جینیس جو کسی ملک اور کسی زمانے کے بڑے سے بڑے شاعر کے مقابلے میں جگہ پا سکتا ہے۔ تاحیات مصائب و آلام میں گرفتار رہا ہے۔ اگرچہ مرنے کے بعد اس کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوتی نظر آرہی ہے کہ "زمانہ میری قدر میرے مرنے کے بعد کرے گا" تاہم غالب کے شیدائیوں نے اپنی محبت اور قدردانی کا ثبوت پیش نہیں کیا ہے۔ غالب کی کوئی عمدہ سوانح حیات بھی مرتب نہیں ہوئی ہے اگرچہ مولانا حالی کی یادگار اپنی جگہ خوب ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ نہ تو وہ غالب کے شایانِ شان ہے اور نہ خود حالی کے۔ غالب کے نظم و نثر کا کوئی

اچھا ایڈیشن موجود نہیں ہے۔ غالب کے نئے اور سستے ایڈیشن تو انھیں ہم مجموعہ اغلاط کا ایک کرشمہ کہہ سکتے ہیں اور بس۔ نہ ہمارے ملک میں غالب سوسائٹی کا وجود ہے نہ کہیں کوئی غالب لیکچر رشپ ہے اور جب کہ اس عظیم شاعر کے مزار کا پتہ چل گیا ہے تاہم اور کچھ نہیں کہہ سکتے سوائے اس کے کہ مرزا کا یہ شعر دہرا دیں۔ افسوس

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا!

کیا دہلی اور اس کے گرد و نواح میں رہنے والے ہمارے قارئین کرام میں کوئی ایسا نکلے گا جو مرزا نوشہ اسد اللہ غالب کے اس خستہ و شکستہ مزار کی صحیح حالت جا کر دیکھے اور اس کی فوری اور اشد ضروری مرمت کا تخمینہ لگا کر ہمیں مطلع کرے، جب تک ایک مناسب اور موزوں میموریل تعمیر نہ ہو کم از کم اتنا تو ہو جانا ضروری ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی گزارش ہے ہمیں یقین ہے کہ ان معلومات کے لیے ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا"

اس پُرخلوص اور پُر درد اپیل کے بعد ۸ جولائی کے شمارے میں مولانا نے پھر لکھا ہے۔

"کامریڈ کے قارئین کرام میں سے ایک صاحب نے ہمیں دہلی سے ایک مراسلہ بھیجا ہے۔ انھوں نے غالب کے مزار کا معائنہ کرنے کے بعد صحیح حالات کا اندازہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ مزار کی حالت نہایت خراب ہے مرمت کی لاگت کا تخمینہ انھوں نے لگایا ہے۔ یہ تخمینہ مرحوم کے شایان شان یادگار قائم کرنے کے لائق نہیں ہے۔ انھوں نے یہ تخمینہ دانستہ کم لگایا ہے۔ کیونکہ زیب و زینت والے آہنی جنگلے اور تعویذ قبر کے چوری ہو جانے کا خطرہ ہے۔ یہ خطرہ ناممکن نہیں۔ قبر عام گزر گاہ سے ہٹ کر واقع ہے۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ جالی کی دیوار لوہے یا اینٹوں کی دیوار سے بہتر رہے گی۔ ایک چھوٹا باغیچہ لگا کر کسی مالی کو قبر کی حفاظت پر بھی مامور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس وقت سب سے زیادہ ضرورت روپے کی فراہمی کی ہے۔

جناب حامد علی خاں اپنے مراسلے میں وضاحت فرماتے ہیں کہ انھوں نے مزار کی زیارت کئی بار کی ہے۔ اور کئی سال بیشتر جب وہاں گئے تھے تو وہ اچھی حالت میں تھا آج موصوف میموریل کی تعمیر شروع ہونے سے قبل کی جانے والی ضروری مرمت کے لیے ہمیں دیا جو کوئی بھی اس کام کا آغاز کرنا چاہتا ہو اسے، رقم بھیجنے کو تیار رہیں۔ غالب کے ایک سچے عاشق سے ایسی ہی توقع تھی۔ ہمیں یقین کامل ہے کہ اور ابھی ایسے غالب پرست موجود ہیں۔ ہم اپنے دہلی کے نامہ نگار سے خط و کتابت کر رہے ہیں۔ بہتر ہے کہ اب ایک مناسب میموریل کے لیے باقاعدہ فنڈ قائم کیا جائے۔ چنانچہ ہم کامریڈ کے کارکنان کی طرف سے عطیات کا اعلان کرتے ہیں ہم نے اس رقم کی تعداد جان بوجھ کر کم رکھی ہے تاکہ اس ہستی کے لیے یہ فریضہ کسی پر بار نہ بنے جس کے بارے میں ان کا ایک بہترین شاگرد اپنے مرثیہ میں کہتا ہے :

دوش یاراں پہ کیوں کے بار ہوا

دل اغیار پر جو بار نہ تھا

علاوہ ازیں ہماری تمنا ہے کہ مرزا نوشہ کی یادگار قائم کرنے میں زیادہ سے زیادہ لوگ ہاتھ بٹائیں کام پر صرف ہونے والی رقم کا اندازہ ہونے کے بعد کام کی تفصیلات بہ آسانی طے ہو جائیں گی۔ وقتی طور پر تو ہمارے منیجر نے خازن کے فرائض انجام دینا منظور کر لیا ہے۔ لیکن ہم مولانا حالیؔ سے گزارش کر رہے ہیں کہ وہ ہندوستان کے تمام صوبوں کی نمائندگی کرنے والی ایک کمیٹی نامزد کریں جس کو مزار کی تعمیر کے منصوبے اور تخمینہ کا کام سپرد کیا جائے اور وہی کمیٹی کا حساب بھی رکھے۔

چندہ فی الحال منیجر کامریڈ ۱۰۹ رپن اسٹریٹ کلکتہ کو بھیجا جا سکتا ہے۔

مزارِ غالب فنڈ

اخبار کامریڈ	۲۵ روپے
کارکنان کامریڈ	۲۵ روپے
میزان	۵۰ روپے

اور جب ان دردمندانہ اپیلوں کا خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا تو انھیں یہ لکھنا پڑا۔

"ہمیں افسوس ہے کہ مزار غالب کے سلسلے میں ہماری اپیل موثر ثابت نہیں ہو رہی ہے لیکن ہمیں یہ معلوم ہے کہ یہ تو ہندوستانی روایات میں داخل ہے کہ چندہ دہندگان اس کے منتظر رہتے ہیں کہ چندہ جمع کرنے والے حضرات ان کے دروازے پر آئیں، تب وہ مجبوراً چندہ دیں گے۔ غالب کے سلسلے میں ہم کسی کو مجبور نہیں کرنا چاہتے۔ یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ زبردستی کی جائے نہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ کوئی صاحب ہزاروں روپے دیں جو لوگ غالب کے مداح ہیں اور غالب سے بخوبی واقف ہیں؟ ان کے لیے مزید کسی گزارش کی ضرورت نہیں ہے۔

مزارِ غالب فنڈ

حامد علی خاں صاحب لکھنؤ	۳۰ روپے
پچھلی رقم	۵۰ روپے
میزان	۸۰ روپے

اس اپیل کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ افسوس کا اظہار کرتے ہوئے مولانا محمد علی رقم طراز ہیں:

"ہمیں افسوس ہے کہ مزار فنڈ کے لیے اور زیادہ چندہ وصول نہیں ہوا لیکن ہمیں اپنے دوستوں سے اطلاع ملی ہے کہ وہ مقامی طور پر چندہ فراہم کر رہے ہیں اور عن قریب خاصی رقم ارسال کریں گے۔

ذیل میں ہم کلکتے کے دو مشہور مسلم تاجران کے اسمائے گرامی کا اضافہ اپنی فہرست میں کر رہے ہیں ان لوگوں نے مرمت کے اخراجات کے بارے میں پوچھا ہے۔

مزارِ غالب فنڈ

جناب محمد شفیق صاحب دہلوی	۱۰ روپے
جناب شوکت علی صاحب	۱۰ روپے

اس ہفتے میں وصول شدہ رقم	۳۰ روپے
پچھلی رقم	۸۰ روپے
کل میزان	۱۰۰ روپے

مولانا محمد علی نے اس سلسلے کو مسلسل جاری رکھا۔

"بڑی تعجب خیز بات یہ ہے کہ مزار غالبؔ کے لیے ہماری اپیل کا ردعمل اس قدر کم ہوا ہے متعدد مراسلہ نگاروں نے ہمیں مطلع کیا ہے کہ مقامی طور پر چندہ اکٹھا کیا جارہا ہے مگر یہ بات اس وقت تک تسلی بخش نہیں ہوسکتی جب تک کہ رقم ہمارے پاس نہ پہنچ جائے۔ رقم موصول ہونے سے قبل ہی کسی طرح کا اعلان نہیں کر سکتے۔ اس سلسلے میں مسلم یونیورسٹی فنڈ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ غالبؔ کے معتقدین مزید کسی تاخیر کے ہمیں چندہ بھیج دیں گے۔ ورنہ ہم یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ لوگوں کے مزاج کی کیفیت آج بھی وہی ہے جو خود شاعر کی اس شعر کی تخلیق کے وقت تھی:

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
کیجیے ہائے ہائے کیا، روئیے زار زار کیوں؟

مزار غالبؔ فنڈ

مولانا ابوالکلام آزاد کلکتہ	۱۰ روپے
پچھلی رقم	۱۰۰ روپے
کل میزان	۱۱۰ روپے ہے

مولانا محمد علی مرحوم پے در پے اپیلیں کرنے کے باوجود خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکے اور مسلسل جدوجہد کا نتیجہ ایک سو دس روپے کی معمولی رقم کی صورت نکلا۔ لیکن مرحوم غالبؔ پرستوں کی اس سرد مہری سے دل برداشتہ نہ ہوئے اور انھوں نے اپنی قلمی جدوجہد جاری رکھی۔ کامریڈ کے ۱۲ جولائی ۱۹۱۱ء کے شمارے میں رقم طراز ہیں۔

"ہم نے اپنے ۲۹ رجون کے پرچے میں لکھا تھا کہ کئی مراسلہ نگاروں نے ہمیں مطلع کیا ہے کہ چندہ مقامی طور پر جمع کیا جا رہا ہے لیکن جب تک وہ موصول نہیں ہو جاتا ہم کچھ اعلان نہیں کر سکتے۔ اب ہمارے پرجوش حامیوں میں سے ایک محسن، بمبئی کے جناب ایم کے آزاد بیرسٹر (اولڈ بوائے علی گڑھ یونیورسٹی) نے ہمیں مبلغ ایک سو پانچ روپے کا چیک بھیجا ہے۔ امید ہے کہ وہ مزید رقم بھی بھیجیں گے۔ مدراس کے ایک مشہور و معروف لیڈر نواب غلام احمد خاں اور ان کے کارکنوں نے پچاس روپے کا ایک چیک بھیجا ہے۔ اور اتنی ہی رقم کا ایک چیک لکھنؤ کے جناب حامد علی خاں صاحب نے غالبؔ کے زبردست مداح ڈاکٹر تیج بہادر سپرو کی طرف سے ارسال کیا ہے۔ یہ رقم ذاتی حیثیت سے بھیجی جانے والی رقموں میں سب سے زیادہ ہے ایک بار پھر ہمارے دل کا حوصلہ بڑھا ہے۔ ورنہ اس دور کی غالب پرستی کو ہم اس بے وقعت، بے اثر طرز تکلم سے زیادہ اہمیت نہ دیتے جس کا گلہ خود شاعر نے اپنے زمانے میں کیا ہے:

ہم ہیں اور آزردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل

دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

ہمیں جناب آزاد کا ایک خط بغرض اشاعت موصول ہوا ہے مگر ہم نے ان کے سوالات کے بجائے اپنے جوابات شائع کرنا زیادہ بہتر سمجھا ہے۔ ہم اپنے کسی گزشتہ پرچے میں دہلی کے ایک نامہ نگار کا حوالہ دے چکے ہیں جنھوں نے ہماری استدعا پر زحمت کر کے قبر کا جائزہ لیا تھا۔ یہ جناب خواجہ تصدق حسین کی ذات تھی اور اغلب یہ ہے کہ دہلی میں اس کام کی ذمہ داری کا بار بھی آپ ہی کے کاندھوں پر پڑے گا۔ موصوف اس خدمت کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔ اس بلند جذبے کو ہم کسی ردعمل یا صلے کی صورت میں پیش کر کے کم کرنا نہیں چاہتے خواہ وہ مدح و ستائش ہی کی شکل میں کیوں نہ ہو۔ بہرکیف چندے کے سلسلے میں ہمیں کوئی خبر نہیں کہ دہلی میں کتنی رقم جمع ہوئی۔ امید ہے کہ یہ رقم غالبؔ کے شایان شان ہوگی۔

جہاں تک مزار کی مرمت کے اخراجات کا سوال ہے تو ان کا تعین

احاطے کے رقبے سے نہیں ہوگا بلکہ ان اشیاء سے ہوگا جن سے مزار کی چھت تعمیر کی جائے گی۔ ہمارے خیال میں اس کے لیے سب سے زیادہ موزوں پتھر "سنگ مرمر" ہی ہوگا۔ اس سے کم تر کوئی پتھر نہیں اور ہمیں یہ امید ہے کہ جس کمیٹی کی تشکیل کے لیے ہم نے مولانا حالی سے گزارش کی ہے اس کو دنیا کے ایک عظیم ترین شاعر کی تربت پر ایک چھوٹی سی CANOPY تعمیر کرنے کی دشواری نہ ہوگی۔ اسی کے ساتھ ہی ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ "کلیات غالب" کے ایک عمدہ ایڈیشن کی اشاعت کی بھی اشد ضرورت ہے۔ جناب آزاد کا خط موصول ہونے سے پہلے (جس میں انھوں نے یہ تجویز پیش کی تھی) ہم مولانا حالی کو اس سلسلے میں لکھ چکے ہیں۔ تاہم قارئین کرام کو یہ ملحوظ رہے کہ مرحوم کے کلیات کی اشاعت تو ہوگی صرف ہمارے اپنے ذوق کی تسکین کے لیے اور ایک معقول اور موزوں یادگار کی تعمیر خالصاً غالب کے لیے۔ حالانکہ مرحوم نے اپنی حیات میں کبھی فانی نمائشوں کی تمنا نہ کی اور اب تو ان کی روح اس بات سے قطعی بے نیاز ہے کہ ہم ان کے جسد خاکی مسکن کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔

تفصیل مزار غالب فنڈ

جناب مرزا محمد عسکری	۱۰ روپے
جناب جے۔ اے کونولی	۱ روپیہ
جناب یعقوب حسن سیٹھ مدراس	۱۰ روپے
جناب خاں صاحب محی الدین بادشاہ مدراس	۱۰ روپے
جناب نواب ایم عابد حسین خاں	۱۰ روپے
جناب نواب غلام احمد کلامی	۱۰ روپے
جناب محمد علی آصف	۵۰ روپے
جناب ایم۔ کے آزاد بمبئی	۲۵ روپے

جناب فضل بھائی سی ابراہیم بمبئی	۲۰ روپے
جناب کے ایم موسیٰ بمبئی	۱۰ روپے
ڈاکٹر تیج بہادر سپرو، الہ آباد	۵ روپے
میزان	۲۱۶ روپے

"کامریڈ" کے ۲۶ اگست ۱۹۱۱ء کے شمارے میں مزار غالب فنڈ کے سلسلے میں مزید وصول شدہ رقم کی مزید تفصیل شائع ہوئی ہے:

مزار غالب فنڈ

مراد آباد کے عطیات (بذریعہ محمد احمد انصاری صاحب)	۳۰ روپے
کرامت اللہ صاحب حیدر آباد	۱۰ روپے
محمد یحییٰ صاحب میرٹھ	۱ روپے
چودھری صفی الزماں تعلقدار بھلول لکھنؤ	۳۰ روپے
پندرھواڑے میں وصول شدہ رقم	۱۷ روپے
پچھلی رقم	۳۲۶ روپے
کل میزان	۳۹۷ روپے

"مزار غالب فنڈ" میں آنے والی رقم کی تفصیل کامریڈ کے پرچوں میں مسلسل شائع ہوتی رہی۔

مزار غالب فنڈ

منشی واحد علی صاحب رام پور	۵ روپے
سلطان مرزا صاحب اعظم گڑھ	۱ روپے
پندرھواڑے میں وصول شدہ رقم	۶ روپے
پچھلی رقم	۳۹۷ روپے
کل میزان	۴۰۳ روپے

مزارِ غالب فنڈ

بہرائچ کے عطیات	۵ روپے
محمد نظیر الاسلام غازی آباد	۲۰ روپے
اے رحیم بخش الٰہی دہلی وکلکتہ	۵۰ روپے
محمد نقی خاں گورکھپور	۳ روپے
پندرھواڑے میں وصول شدہ رقم	روپے
پچھلی رقم	۴۰۳ روپے
کل میزان	۴۶۳ روپے

مزارِ غالب فنڈ

جناب تصدق حسین خاں صاحب دہلی	۱۰ روپے
شمس العلماء الطاف حسین حالی پانی پت	۱۰ روپے
سید محمد مجید صاحب کلکتہ	۱ روپے
ڈاکٹر ڈینیس راس	۵ روپے
ایم معظم علی صاحب	۵ روپے
اسماعیل آصف صاحب کلکتہ	۱۰ روپے
پندرھواڑے میں وصول شدہ رقم	۴۶ روپے
پچھلی رقم	۴۶۳ روپے
کل میزان	۵۰۹ روپے

مزارِ غالب فنڈ

(مسوری میں ایچ ایس نے جمع کیا)

آر بی قادری صاحب	۱ روپیہ

محمد ایوب صاحب	۱ روپیہ
این۔ ایچ انصاری صاحب	۱ روپیہ
ڈاکٹر زید۔ یو احمد صاحب	۱ روپیہ
نعیم الدین صاحب	۱ روپیہ
خلیفہ ایس اے حسین صاحب	۱ روپیہ
قاضی سرفراز حسین صاحب	۱ روپیہ
احمد علی خاں شیروانی صاحب	۴ روپیہ
پندرھواڑے میں وصول شدہ رقم	۱۱ روپے
پچھلی رقم	۵۰۹ روپے
کل میزان	۵۳۰ روپے

مزار غالب فنڈ

ایم ایم جلال الدین صاحب دارجلنگ	۲ روپے
ایم اے سلام رفیقی صاحب رنگون	۱۰ روپے
ایم حامد حسین صاحب مئو	۱ روپیہ
آغا محمد صفدر صاحب	۵ روپیہ
کے پی جیسوال صاحب کلکتہ	۳ روپے
پندرھواڑے میں وصول شدہ رقم	۳۱ روپے
پچھلی رقم	۵۳۰ روپے
کل میزان	۵۴۱ روپے

مزار غالب فنڈ

سید عبد العاص صاحب بانکی پور	۱ روپے

مرزا سعید الدین احمد صاحب دہلی	۲۵ روپے
ایس ایم اے رسول صاحب کلکتہ	۱۰ روپے
پندرھواڑے میں وصول شدہ رقم	۳۶ روپے
پچھلی رقم	۵۴۱ روپے
کل میزان	۵۷۷ روپے

مزار غالب فنڈ کی مندرجہ بالا تفصیل پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ مولانا محمد علی کی مسلسل اپیلوں اور کاوشوں کے باوجود چندے کی رفتار نہایت سست رہی۔ لیکن اس عام بے حسی اور سست رفتاری سے مولانا کے حوصلے پست نہ ہوئے اور وہ اپنے مشن میں جوش وجذبے کے ساتھ لگے رہے۔ ۲؍دسمبر ۱۹۱۱ء کے کامریڈ میں انھوں نے لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کراتے ہوئے لکھا ہے۔

"جیسا کہ مزار غالب فنڈ قائم کرتے وقت ہم نے گزارش کی تھی کہ اس کا مقصد صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ ایک معقول اور عظیم الشان یادگار اس عظیم شاعر کے شایان شان تعمیر ہو۔ فنڈ کے لیے ہماری اپیلیں رائگاں نہیں گئی ہیں۔ اگرچہ مسلم یونیورسٹی کیلیے چندہ کیے جانے کی وجہ سے عوام پر چندے کا بار پڑا ہے۔ دوسری طرف حال ہی میں ترکی ریلیف فنڈ کے لیے بھی اپیلیں کی گئی ہیں تاہم ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کو غالب سے جو عقیدت ہے اس کے پیش نظر ہم ناامید نہیں ہیں بلکہ ہمیں یہ یقین ہے کہ ہماری کوششیں بارآور ہوں گی اور غالب میموریل کے لیے بھی فنڈ جمع ہو گا۔ ایک مراسلہ نگار نے اطلاع دی ہے کہ غالب مرحوم کے بعض اعزہ یہ گوارہ نہ کریں گے کہ ان کے جلیل القدر بزرگ کے مزار کی تعمیر عوامی چندے سے ہو۔ ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ غالب مرحوم کے اعزہ اپنے فرض سے غافل نہیں ہیں۔ موجودہ تحریک شاعر کے کثیر التعداد معتقدین کی اس تمنا پر جاری کی گئی ہے کہ ہم اپنے محبوب شاعر کی قبر پر ایک مناسب مقبرہ تعمیر کر کے اپنی دلی محبت اور عقیدت کا اظہار کر سکیں ہمیں یقین ہے کہ مرحوم کے اعزہ خفا ہونے کے بجائے ہمارے

جذبے کی قدر کریں گے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خود غالب کے خاندان کے ایک صاحب نے نہ صرف ہمارے منصوبے کی تائید کی ہے بلکہ میموریل کے فنڈ میں چندہ بھی دیا ہے۔ واضح رہے کہ موصوف خاندانی فرائض کی رو سے قبر کی دیکھ بھال کے لیے، جہاں تک ہمیں علم ہے تنہا ذمہ دار ہیں۔ اگر ہمارے نامہ نگار کی اطلاع صحیح ہے تو واقعی یہ افسوس کی بات ہے کہ آج وہ اعزہ جنھوں نے اتنی مدت تک اپنے بزرگ کی قبر کی کوئی خبر نہ لی اب عوام کے جذبات کی ناقدری کر رہے ہیں۔ جو صرف اس بات کے خواہشمند ہیں کہ مزار کی مرمت کے اخراجات میں شرکت کی سعادت حاصل کریں۔ ان کا رویہ دیکھو کہ غالب کا یہ شعر یاد آجاتا ہے:

زاہد نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

بہرکیف ہمیں مسرت ہے کہ ملک کے اکابرین علم و دانش نے ہمارے منصوبے کی تائید کی ہے۔ ہمارے ایک محترم کرم فرما مراسلہ نگار جو غالب کے دیرینہ عاشق ہیں اور خود بھی عالی مقام شاعر ہیں، مزار غالب فنڈ میں سو روپیہ چندہ دینے کے متمنی ہیں اور اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"آپ نے ایک بہت ہی مستحسن مقصد کے لیے فنڈ کھولا ہے لیکن ابھی تک معمولی رقم جمع کر سکے ہیں۔ اس سے اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ ہمارے دلوں میں اپنے عظیم المرتبت بزرگوں کے لیے احترام کا جذبہ کتنا کم ہے۔ تاوقتیکہ وہ ایسی ہستیاں نہ ہوں جن کی آرام گاہیں متعلقہ افراد کے لیئے کاروبار کا ذریعہ بن جائیں۔ کسی کو ان کا خیال تک نہیں آتا۔ پھر غالب جیسا شخص ہم سے کیا پائے گا! ہمارے بزرگوں نے ہم پر کتنے احسان کیوں نہ کئے ہوں اور وہ کتنے ہی مشہور کیوں نہ ہوں، کسی کو خیال نہیں آتا کہ آخر ان کی خاک کہاں دفن ہو گی۔ ہو سکتا ہے ہمارے بعض شرعی مولویوں نے اس مرحوم ہستی پر بھی کفر کا فتویٰ صادر کر دیا ہو۔ جیسا کہ قوم و ملت کی اور بہت سی ہستیوں پر کیا گیا اور اس طرح گویا ان حضرات کی

قبروں کا احترام ان پر واجب نہ رہا اور وہ اپنے فرائض سے بری الذمہ ہو گئے۔
بہر حال ایک غریب آدمی ہوں اور پچھلے دنوں خرچ سے بھی زیر بار رہا۔ پھر بھی اس فنڈ میں سو روپے بھیج رہا ہوں۔ آپ کو اختیار ہے کہ یہ رقم اپنی فہرست میں میرے نام سے جمع کر لیں۔"

مولانا محمد علی کے ان خیالات کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کی مناسب یادگار قائم کرنے کی تجاویز اب سے بہت پہلے ذہنوں میں آئی تھیں اور ان کا باقاعدہ اظہار بھی کیا گیا تھا یہی نہیں، اس سلسلے میں عملی قدم بھی اٹھائے گئے تھے۔ مولانا محمد علی کی تحریروں کا اثر اس دور کے دوسرے رسائل و اخبارات کے یہاں بھی نظر آتا ہے۔ اسی دوران، جب کہ کامریڈ میں مزار غالب فنڈ کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا انھوں نے رسالہ ادیب الٰہ آباد میں ایک اپیل شائع کرائی ہے، جس میں غالب کی عظمت کے شایان شان مزار تعمیر کرنے کی درخواست کی ہے۔ غالب کے مزار سے متعلق پانیر کے انگریزی نامہ نگار کا ایک طویل مراسلہ بھی نقل کیا گیا ہے اور اس مقصد کے لیے غالب میموریل فنڈ قائم کرنے کا اعلان کیا ہے ۔"ادیب" میں غالب کی یادگار قائم کرنے کا سلسلہ جاری تھا کہ دوسرے نے بھی اس طرف توجہ کی۔

ایڈیٹر "تمدن" لکھنؤ کے نام ایک خط میں اظہر دہلوی لکھتے ہیں:

اگرچہ خدائے سخن مرزا غالب مغفور کے شکستہ مزار کی مرمت کی تحریک عرصہ ہوا شروع ہو گئی تھی مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اب اس کا وقت آگیا ہے۔

خاکسار کو اس تحریک کے ساتھ کامل ہمدردی اور دلچسپی ہے اور اپنی بساط کے مطابق کچھ عملی حصہ لینا چاہتا ہوں۔ غالباً جناب کو معلوم ہوگا کہ خاکسار نے ہندوستان کے قومی شعراء کے کلام کا مجموعہ بہ نام "عطر سخن" (جذبات مسلم، شائع کیا ہے۔ تمام منظومات اسلامیات سے متعلق ہیں۔ اس مجموعے میں شبلی، حالی، اکبر، اقبال، ظفر، نیرنگ، شفق، اسماعیل، سرسید، نیاز، آغا حشر اور دیگر مشہور شعراء کی ۵۰ منظومات مشتمل ہیں۔

میں اعلان کرتا ہوں کہ ماہ اکتوبر میں جذبات مسلم کی جس قدر جلدیں

فروخت ہوں گی ان کی قیمت کی رقم میں پچیس فی صد "مزار غالب فنڈ" میں دوں گا
اگر اس سلسلے میں کم سے کم چار صد کتابیں بھی نکل گئیں (جو ہمدردان غالب نیز وسعت
اردو کے مقابلے میں معمولی سی بات ہے)، تو خاکسار اس سرمایے میں سے مبلغ ایک
صد روپیہ دینے کی سعادت و مسرت حاصل کر سکے گا۔ کتاب کی اصل قیمت ۸عہ ہے
لیکن اس اعلان کے سلسلے میں صرف ایک روپیہ قیمت لی جائے گی۔ احباب عجلت
فرمائیں، نسخے کم ہیں، حلقہ احباب میں بھی تحریک کیجیے اور اس طرح نام نیکو رفتگاں
کے ضائع کرنے کے الزام سے بری ہو جیے۔" ؎

اور یہی نہیں، اس شمارے میں ایڈیٹر تمدن کی طرف سے ایک اشتہار بھی شائع کیا گیا
ہے جس میں تمدن کی طرف سے امداد و اعانت کا اعلان کیا گیا ہے۔

"آج کل پھر مزار غالب مرحوم کی مرمت کے متعلق اخبارات اور رسالہ جات میں مضامین
شائع ہونے شروع ہو گئے ہیں اور بعض صاحبان کام کو پورا کرنے کے لیے
کتابوں کو فروخت کر کے ان کی قیمت میں سے کچھ روپیہ دینے پر آمادہ ہو گئے
ہیں چونکہ ہم "تمدن" کو بھی اس نیک کام میں شریک کرنا چاہتے ہیں اس لیے
اعلان کرتے ہیں کہ دفتر رسالہ "تمدن" کی نو طبع دو کتابیں یعنی اخلاقی ناول "سعید"
"سعادت" مصنفہ قاری سرفراز حسین صاحب جس قدر جلدیں ماہ اکتوبر و نومبر میں
فروخت ہوں گی ان کی قیمت میں سے ۱۰ فی صدی ہم اس فنڈ میں دیں گے۔
"سعید" کی قیمت علاوہ محصول ۸ اور "سعادت" کی قیمت علاوہ محصول ۸ ہے۔"

یہ انفرادی اور اجتماعی کوششیں بلکہ یہ تمام عملی اقدامات ثبوت ہیں اس بات کا کہ غالب
کی یادگار اور ان کے شایان شان ادبی کام کرنے کی تجاویز آج کی دین نہیں ہیں بلکہ لوگوں
کی بے توجہی کے سبب آج یہ محسوس ہو رہا ہے یا محسوس کیا جا رہا ہے کہ یادگار قائم کرنے
اور یادگار منانے کی ساری تجویزیں اسی زمانے کے ذہنوں کی پیداوار اور اسی زمانے کے
لوگوں کی عملی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ کیسی حق تلفی ہے۔ یہ ان لوگوں کی، جنھوں نے اس راستہ
میں سب سے پہلے چراغ جلائے تھے۔ ہاں ان کی خطا یہ ضرور تھی کہ لوگوں نے خلوص اور سچی

ہمدردی کے جذبے کے تحت ایسے کام کرنے کی تمنا کی تھی۔ جن میں نمود و نمائش کو دخل نہیں تھا۔ (غالب صدی نمبر اردوئے معلّٰی دہلی یونیورسٹی)

حواشی :-

۱؎ غالب اور ابوالکلام، مرتبہ عتیق صدیقی : ص ۱۴۰۔ ۱۴۱

۲؎ غالب کی یادگار قائم کرنے کی اولین تحریر: ڈاکٹر فرمان فتحپوری (ہماری زبان علی گڑھ ۲۲ دسمبر ۱۹۶۸ء ص ۴)

۳؎ شعرا کے مزار۔ جہانگیر مخزن لاہور، مارچ ۱۹۰۷ء ص ۵۹

۴؎ غالب نے اپنے مشہور فارسی ترکیب بند (حبسیہ) میں لکھا ہے ؎

ہمدماں در دلم از دیدہ نہایند ہمہ — غالب غم زدہ را روح و روایند ہمہ
درمیاں ضابطہ مہر و وفائے دوست — حق بر نیم کہ ہر آئینہ برآیند ہمہ
روزے از مہر نگفتید فلانے چوں است — بارے از لطف بگوئید چہ ایند ہمہ
چارۂ گر نتواں کرد دعائے کافی ست — دل اگر نیست خداوند زبایند ہمہ

۵؎ غالب کا مزار، ترجمہ از ہفتہ وار کامریڈ کلکتہ ۱۷ جون ۱۹۱۱ء ۱۴۴۔ ۱۴۵

۶؎ 〃 〃 〃 〃 ۸ جولائی ۱۹۱۱ء ص ۲۷

۷؎ 〃 〃 〃 〃 ۱۵ جولائی ۱۹۱۱ء

۸؎ 〃 〃 〃 〃 ۲۲ جولائی ۱۹۱۱ء

۹؎ "کامریڈ" میں یہ مصرع اسی طرح شائع ہوا ہے لیکن اصل مصرع یہ ہے:

روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں

۱۰؎ غالب کا مزار ترجمہ از کامریڈ۔ ۲۹ جولائی ۱۹۱۱ء ص ۸۸

۱۱؎ "واعظ نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو" (دیوان غالب، اردو، نسخۂ عرشی، ص ۲۴۳)

۱۲؎ غالب کا مزار۔ کامریڈ کلکتہ جلد ۲، شمارہ ۲۳، ۲ دسمبر ۱۹۱۱ء) ص ۴۷۴۔ ۴۷۵

۱۳؎ "مزار غالب"، پیارے لال شاکر میرٹھی: ادیب الٰہ آباد جلد ۲، اگست ۱۹۱۱ء ص ۱۰۱۔ ۱۰۲

۱۴؎ ادیب کے ستمبر اکتوبر نومبر دسمبر کے شماروں میں چندہ دینے والوں کے نام شائع کیے گئے ہیں۔ دسمبر کے شمارہ میں ہی یہ شکوہ کیا گیا ہے کہ معاونین ادیب اس طرف توجہ نہیں کر رہے ہیں۔

۱۵؎ "تمدن"، لکھنؤ جلد ۱۳۔ شمارہ ۱۔ اکتوبر ۱۹۱۶ء

غالب کا سفر کلکتہ

مرزا غالب نے اپنی زندگی میں صرف ایک طویل سفر کیا تھا، جب ان کو اپنی پنشن کے سلسلے میں دہلی سے کلکتہ جانا پڑا تھا۔ دوران سفر اور قیام کلکتہ میں کچھ ایسے حالات و واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے غالب کے اس سفر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

غالب کو دلّی سے اس قدر لگاؤ تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر کہیں جانا پسند نہ کرتے تھے مگر معاشی پریشانی نے انھیں سفر کے لیے مجبور کیا۔ مولانا حالؔی نے اس سفر کے مقصد پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

"کلکتہ جانے کا سبب یہ تھا کہ مرزا کے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے وفات پائی تھی اس وقت مرزا کی عمر نو برس کی تھی اور ان کے بھائی کی عمر سات برس کی تھی۔ نصر اللہ بیگ کی وفات کے بعد ان کے متعلقوں اور وارثوں کے لیے جن میں مرزا اور ان کے بھائی بھی شریک تھے، جو پنشن گورنمنٹ نے ریاست فیروز پور جھرکہ پر محمول کردی تھی جب تک کہ مرزا صغر سن رہے جو کچھ وہاں سے ملتا رہا پاتے رہے۔ جب سن تمیز کو پہنچے اور شادی ہوگئی، عالم شباب اور خانہ داری کی ضرورتیں بہت بڑھ گئیں۔ اور گھر میں جو کچھ وہاں تھا وہ بھی چند روز میں سب خرچ ہوگیا۔ لاچار فکر معاش دامن گیر ہوئی اول مرزا کو غلط یا صحیح یہ خیال پیدا ہوا کہ فیروز پور جھرکہ سے جس قدر پنشن ہمارے

خاندان کے لیے گورنمنٹ سے مقرر کرائی تھی اس قدر ہم کو نہیں ملتی۔ ضرورتوں نے
سخت تنگ کر رکھا تھا۔ ادھر قرض خواہوں کے تقاضے سے ناک میں دم آگیا تھا
ادھر چھوٹے بھائی کو جنون ہوگیا۔"

غالبؔ ان پریشان کن حالات سے تنگ آگئے تو دوستوں کے مشورے پر فیروز پور جھرکہ گئے تاکہ نواب سے پنشن میں اضافے کی درخواست کریں مگر ان کا یہ سفر ناکام رہا۔ نواب نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی۔ غالبؔ بے نیل مرام واپس ہوئے اور یہ طے کیا کہ نواب نے جو پنشن کی تقسیم کی ہے اس کے خلاف کلکتہ میں گورنر جنرل کے یہاں اپیل کریں، ان دنوں ہندوستان کا دارالسلطنت کلکتہ تھا۔

غالبؔ اگست ۱۸۲۱ء میں دہلی سے کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے دوران سفر میں انھوں نے کئی مقامات پر قیام کیا۔ سب سے زیادہ عرصہ لکھنؤ میں گزرا اس کے بعد بنارس میں۔ اور یہ دونوں مقامات کئی حیثیتوں سے اہم تھے۔ لکھنؤ میں مرزا غالبؔ پانچ مہینے سے زیادہ ٹھہرے (غالبؔ نے اودھ کے وزیر کی تعریف میں جو نثر لکھی ہے اس سے ان کے قیام لکھنؤ کی مدت گیارہ ماہ معلوم ہوتی ہے) یہ مدت اچھی خاصی مدت ہے۔ یہاں وہ ہر طبقہ کے لوگوں سے ملے ہوں گے امرا ور ؤسا کا ڈھنگ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا۔ لکھنؤ اس زمانے میں مشرقی تہذیب کا آخری نمونہ کہا جاتا تھا مگر یہ عجیب بات ہے کہ لکھنؤ میں غالبؔ کے زمانہ قیام کے حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ کسی تاریخ و تذکرے سے تفصیل تو درکنار قیام لکھنؤ کے مختصر حالات پر بھی روشنی نہیں پڑتی۔ اس سے یہ نتیجہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ زمانہ غالبؔ نے بہت خاموشی سے گزارا، یا پھر معاصر، مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے کسی خاص سبب کی بنا پر غالبؔ کے قیام لکھنؤ کے حالات پر سکوت اختیار کیا ہے۔ یا ممکن ہے کہ اس وقت اہل لکھنؤ نے ان کی کوئی اہمیت ہی نہ دی ہو، ناسخ سے غالبؔ کے خصوصی تعلقات تو ثابت ہیں مگر ان دنوں ناسخ عتاب شاہی کا شکار تھے اور الہ آباد میں مقیم تھے یہ نصیرالدین حیدر بادشاہ اودھ کا عہد حکومت تھا . . . . . روشن الدولہ وزیر اعظم تھے۔ (غالبؔ جب لکھنؤ پہنچے، غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ اور آغا میر وزیر تھے، مگر کچھ عرصہ بعد وہ معزول کردیا گیا اور روشن الدولہ وزیر مقرر ہوئے)، روشن الدولہ نے غالبؔ کی کچھ آؤ بھگت ضرور کی۔ بعض دوسرے

علمار نے بھی ان کی قدر و منزلت کی، مگر ۵ ماہ سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود کسی اہم علمی و ادبی مباحثے اور شعر و سخن کی محفلوں کا کوئی قابلِ ذکر واقعہ معلوم نہیں ہوا، نہ غالبؔ ہی نے تفصیل سے کہیں اس کا ذکر کیا ہے۔ مولانا حالیؔ نے البتہ جو کچھ لکھا ہے اس کا اقتباس یہ ہے:

جب مرزا نے دلی سے کلکتہ جانے کا ارادہ کیا تھا۔ اس وقت راہ میں ٹھہرنے کا کوئی مقصد نہ تھا۔ مگر چونکہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مدت سے چاہتے تھے کہ مرزا ایک بار لکھنؤ آئیں، اس لیے کانپور پہنچ کر ان کو خیال آیا کہ لکھنؤ دیکھنے چلیے۔ اس زمانے میں نصیر الدین حیدر، فرماں روا، اور روشن الدولہ نائب السلطنت تھے اہل لکھنؤ نے مرزا کی عمدہ طور پر مدارات کی اور روشن الدولہ کے ہاں بعنوان شائستہ ان کی تقریب کی گئی۔ مرزا سے اس پریشانی کے عالم میں قصیدہ تو سرانجام نہیں ہو سکا مگر ایک مدحیہ نثر تعلیل میں جو ان کے مسودات میں موجود ہے نائب السلطنت کے سامنے پیش کرنے کے لیے لکھی تھی۔ لیکن مرزا نے ملاقات سے پہلے دو شرطیں ایسی پیش کیں جو منظور نہ ہوئیں۔ ایک یہ کہ نائب السلطنت میری تعظیم دیں۔ دوسرے نذر سے مجھے معاف رکھا جائے۔ اسی وجہ سے مرزا بغیر اس کے کہ روشن الدولہ سے ملیں اور وہ نثر پیش کریں۔ وہاں سے کلکتہ روانہ ہو گئے مگر معلوم ہوتا ہے کہ کلکتہ سے واپس آنے کے بعد انھوں نے ایک قصیدہ نصیر الدین حیدر کی شان میں لکھ کر ایک دوست کے توسط سے گذارا تھا اور اس پر پانچ ہزار روپے بطور صلے کے ملنے کا حکم ہوا تھا۔

شیخ امام بخش ناسخ نے مرزا کو لکھا کہ پانچ ہزار روپے تھے۔ تین ہزار روشن الدولہ کھا گئے اور دو ہزار متوسط کو دے کر کہا کہ اس میں سے جو مناسب سمجھو مرزا کو بھیج دو۔ مرزا نے یہ سن کر کچھ تحریک کی، مگر تین دن بعد خبر پہنچی کہ نصیر الدین حیدر مر گئے۔ پھر واجد علی شاہ کے زمانے میں مرزا نے سلسلہ جنبانی کی اور پانچ سو روپے سالانہ ہمیشہ کے لیے وہاں سے مقرر ہو گئے۔ لیکن صرف دو برس گزرے تھے کہ ریاست ضبط ہو گئی اور وہ دفتر گاؤ خورد ہو گیا۔"

غالب پر تحقیقی کام کرنے والوں کو ان کے زمانہ قیام لکھنؤ کے حالات کا پتہ لگانے میں ابھی تک کوئی کامیابی نہیں ہوئی بہرحال یہ تو ماننا پڑے گا کہ لکھنو کے حالات اور یہاں کی تہذیب و معاشرت سے مرزا کو واقفیت ضرور حاصل ہوئی لیکن ان کی تحریروں سے لکھنؤ کے متعلق کوئی دلچسپی یا تاثر نہیں ظاہر ہوتا بلکہ کسی ناگفتہ بہ واقعہ کی طرح اس کا ذکر کیا ہے۔

لکھنؤ میں مرزا غالب نے فارسی شاعری کی ناقدردانی کا ذکر کر کے دوران قیام میں چند غزلیں اردو میں کہیں، اسی زمانے کا کہا ہوا ایک قطعہ پیش ہے۔

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی

ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر

عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ہم کو

لیے جاتی ہے ہمیں ایک ایک توقع غالبؔ

جادہ رہِ کشش کاف کرم ہے ہم کو

وزیر اودھ نے نواب سے ملاقات کرانے کی جو شرطیں پیش کی تھیں، ان کو مرزا کی خوددار طبیعت نے گوارہ نہ کیا جس کا مختصراً ذکر غالبؔ نے اپنے ایک فارسی خط میں کیا ہے:

"آنچہ در باب ملازمت قرار یافت خلاف آئین خویشتن داری و ننگ شیوہ خاکساری بود"

اودھ کے بادشاہ کی تعریف میں انھوں نے جو پہلا قصیدہ لکھا تھا، اس میں بھی اس طرف اشارہ کیا ہے:

ناز پروردۂ خلوت گہہ آزادگیم

کافرم گر سرا پردہ سلطاں رفتم

من ہم از خیل کریمانم و خجلت نبود

گر بدریوزہ بہ درگاہ کریماں رفتم

اس قصیدے میں غالبؔ نے اپنے مصائب کا تذکرہ اور دہلی سے لکھنؤ تک کے

سفر کا حال لکھا ہے۔

مرزا غالبؔ لکھنؤ سے ۲۷ رجون ۱۸۲۷ء کو کلکتہ جانے کے لیے روانہ ہوئے۔ تین دن میں کانپور پہنچے۔ وہاں سے باندہ گئے جہاں احمد علی صدر امین ان کے قدردان تھے۔۔۔۔ انھوں نے مرزا غالبؔ کی بہت خدمت کی۔ اور ان کو آرام سے رکھا اور ان کے لیے کلکتہ کے دوستوں اور حاکموں کو سفارشی خطوط لکھ کر دیئے۔ باندہ سے غالبؔ موڈا گئے اور موڈا سے جلّہ تارا۔ یہ سفر انھوں نے گھوڑا گاڑی سے طے کیا۔ جلّہ تارا سے کشتی کے ذریعے الہ آباد پہنچے، یہاں ان کو کوئی ناخوشگوار واقعہ بھی پیش آیا تھا، جس کی طرف انھوں نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔

نفس بہ لرزد زیاد مہیب کلکتہ
نگاہ خیز ز ہنگامہ الہ آباد

چوں کہ واپسی میں بھی مرزا غالبؔ الہ آباد ہوتے ہوئے دہلی آئے تھے، اس لیے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ واقعہ جس کی طرف انھوں نے اشارہ کیا ہے جاتے وقت پیش آیا تھا یا واپسی میں بہر حال الہ آباد سے غالب بنارس پہنچے۔ مرزا کو بنارس کی آب و ہوا بہت راس آئی اور وہاں کے قیام کے گہرے نقوش ان کے دل و دماغ پر ثبت ہوئے۔ انھوں نے بنارس کی تعریف میں ایک مثنوی "چراغ دیر" کے نام سے لکھی جو ان کی مثنویات میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس مثنوی میں مرزا غالبؔ نے یہ تک لکھ دیا ہے کہ اگر نوجوانی میں یہاں آیا ہوتا اور خانہ داری کا جھگڑا نہ ہوتا تو یہیں رہ جاتا۔ انھوں نے بنارس کی تعریف میں نہایت پر اثر اشعار لکھے ہیں:

عبادت خانہ ناقوسیاں است
ہمانا کعبۂ ہندوستاں است

تعالی اللہ بنارس چشم بددور
بہشت خرم و فردوس معمور

غالبؔ کی خواہش تھی کہ بنارس سے کلکتہ تک کا سفر کشتی کے ذریعے طے کریں مگر اخراجات زیادہ ہونے کی وجہ سے گھوڑے پر سفر کیا۔ پٹنہ اور مرشدآباد ہوتے ہوئے سہ شنبہ ۲۱ر فروری

۱۸۴۸ء

۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچ گئے اور محلہ شملہ بازار میں مرزا علی سوداگر کی حویلی میں ایک بڑا مکان دس روپے ماہوار کرایہ پر لے لیا۔ کلکتہ پہنچنے کا ذکر غالب نے اس طرح کیا ہے :

غالب رسیدہ ایم بہ کلکتہ وز سے
از سینہ داغ دوری احباب شستہ ایم

کلکتہ میں مرزا غالب کی بہت قدردانی ہوئی۔ حکام نے ہمت افزائی کی۔ علمی حلقوں میں ان کا پرجوش خیر مقدم ہوا۔ دہلی سے کلکتہ تک کا سفر مرزا غالب کے لیے تجربات و معلومات کے نقطہ نظر سے مفید ثابت ہوا وہ کچھ دیکھنے، سننے اور لکھنے لکھانے کے لیے آمادۂ سفر نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کا مقصد محض پنشن کا اجرا و اضافہ تھا مگر یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں انگریزی تہذیب اپنا اثر جما رہی تھی، مشرقی تہذیب و اخلاقی قدریں مائل بہ تنزل تھیں لیکن مشرق و مغرب کے اس سنگم (کلکتہ) سے ایک نئی تہذیب جنم لے رہی تھی غالب اس نئی تہذیب سے روشناس ہوئے۔ انھوں نے مغربی تہذیب کی رنگینیوں اور دلکشیوں کو غور سے دیکھا۔ جو تیزی سے ہندوستانی تہذیب پر اپنا تسلط جما رہی تھی۔ زرق برق لباسوں میں ملبوس یوروپین خواتین کا آزادی و بے باکی کے ساتھ پھرنا، مردوں سے مصافحہ کرنا، ناچ رنگ کی محفلوں میں ان کی بلا جھجک شرکت، غالب کے لیے انوکھی اور نئی باتیں تھیں۔ ظاہر ہے انھوں نے ان حالات کا بہ نظر غور مشاہدہ کیا ہوگا۔ جس کی جھلک ان کے بعض اشعار میں ملتی ہے۔

کلکتہ میں غالب نے مشاعروں میں بھی شرکت کی، وہاں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک مدرسہ عالیہ جاری کیا تھا۔ اس میں ایک بزم سخن بھی قائم تھی۔ اور وہاں ہر مہینہ کے پہلے اتوار کو مشاعرہ ہوتا تھا۔ ان مشاعروں میں اردو اور فارسی میں غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ غالب نے ایک مشاعرے میں ایک فارسی غزل پڑھی، جس کا مقطع ہے۔

گر دہم شرح ستم ہائے عزیزاں غالب
رسم امید ہمی از جہاں برخیزد

اسی غزل کا ایک شعر ہے:

جزوے از عالم و از ہمہ عالم بیشتم
ہم چو موئے کہ بتاں راز میاں برخیزد

اس شعر پر قتیلؔ کے حامیوں نے اعتراض کیا کہ "ہمہ" بہ قول قتیلؔ واحد سے پہلے نہیں آسکتا، اس لیے یہ شعر غلط ہے۔ غالباً اسی مشاعرے یا کسی دوسرے مشاعرے میں غالبؔ کے اس شعر پر بھی پیروانِ قتیلؔ نے سخت اعتراض کیا:

شور اشکے بہ فشار بن مژگاں دارم

طعنہ بر بے سر و سامانی طوفان زدہ

معترضین میں مولوی عبدالقادر رام پوری، مولوی کرم حسین بلگرامی، نعمت علی عظیم آبادی پیش پیش تھے۔ غالبؔ ان اعتراضات کو درست نہیں سمجھتے تھے ان دنوں شہزادۂ کامران کی طرف سے کفایت خاں بحیثیت سفیر کلکتہ آئے ہوئے تھے، وہ ایرانی تھے، انھوں نے غالبؔ کی تعریف اور حمایت کی۔ بعض اہل علم بھی ان کے حمایتی ہوگئے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مخالفین نے غالبؔ کو تنگ کیا۔ غالبؔ نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں دیوان سنگھ کھتری (نومسلم نام محمد حسن قتیل) کی بات بطور سند نہیں مان سکتا۔ اس پر ان کے خلاف ہنگامہ کیا گیا۔ غالبؔ کے لیے پردیس میں یہ مخالفت پریشان کن تھی۔ تاہم . . . انھوں نے مخالفین کو ان کے اعتراضات کے جواب ایک مثنوی میں دیے۔ اس مثنوی کا نام "باد مخالف" رکھا۔ "باد مخالف" مرزا کی معروف مثنوی ہے۔

کلکتہ میں مرزا کو چند اچھے دوست بھی ملے، ان میں سب سے زیادہ اہمیت مولوی سراج الدین احمد لکھنوی کو حاصل ہے، جن کے نام مرزا کے فارسی خطوط بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ یہ اخبار "آئینۂ اسکندر" سے متعلق تھے۔ اور بارسوخ آدمی تھے۔ انھیں کی فرمائش پر غالبؔ نے کلکتہ میں اپنے اردو فارسی کلام کا انتخاب کیا جسے "گل رعنا" کے نام سے موسوم کیا۔ دوسرے رفیق میر حسن علی لکھنوی تھے جو غالبؔ کے قدردانوں میں تھے۔

کلکتہ میں غالبؔ کا قیام تقریباً دو سال رہا۔ وہاں وہ گورنر جنرل سے بھی ملے، وعدے وعید بھی ہوئے مگر اصل مقصد میں انھیں ناکامی ہوئی اور چاروناچار دہلی واپس ہوئے۔ ۱۱ نومبر ۱۸۲۹ء کو غالبؔ دہلی واپس پہنچے۔ ان کا یہ سفر حامیان قتیل سے معرکہ آرائی کے باعث اردو ادب کی تاریخ کا اہم سفر ہے۔ اس کے علاوہ اس سفر کی بدولت غالبؔ کی دو اچھی مثنویاں "باد مخالف"، "چراغ دیر" اردو ادب کو ملیں۔ (غالب صدی نمبر ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ)

غالبؔ ـــــــ حیوانِ ظریف

۱۸۶۹ء ہندوستان کی تاریخ میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس سال ہمارے ملک کا ایک درخشندہ ستارہ ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا اور اسی کے کچھ ماہ بعد دوسرا تارہ طلوع ہوا۔ غروب ہونے والا ستارہ ہندوستان کا عظیم شاعر و فنکار غالبؔ تھا اور جو تارہ طلوع ہوا ہے اسے دنیا مہاتما گاندھی کے نام سے جانتی ہے جس نے عدم تشدد اور سچائی کا راستہ اپنا کر مادرِ وطن کو غلامی کے شکنجے سے نجات دلائی۔

نصف صدی سے زائد عرصہ تک اردو زبان و ادب کی گراں قدر خدمت انجام دینے، اسے وسعت و جامعیت عطا کرنے اور فن کی عظیم ترین بلندیوں تک پہنچانے والے لافانی فن کار مرزا غالبؔ ہمہ گیر اور ہمہ جہت صفات کے حامل تھے۔ شوخی، زندہ دلی اور خوش مذاقی ان کی فطرت تھی اور سوز و گداز، رحم دلی، عالی ظرفی اور بلند نظری، خاصہ طبیعت۔ قدرت نے انھیں غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ عام ڈگر سے ہٹ کر چلنا ان کا مزاج تھا اور جدت و ندرت سے کام لینا ان کی عادت۔ لکیر کے فقیر رہنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ فرسودہ روایات اور از کار رفتہ اقدار سے چمٹے رہنا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ نئی اور غیر معمولی بلکہ انوکھی بات کو انوکھے اور نرالے انداز میں کہنا ان کا شعار تھا۔ تصنع، بناوٹ اور ظاہر داری سے انھیں چڑ تھی۔ وہ سادگی کے پجاری تھے اور سچائی کے علم بردار تھے۔ ان کی شخصیت کی طرح ان کا فن بھی ہمہ گیر اور ہمہ جہت ہے انھیں

غیر معمولی صلاحیتوں وخوبیوں کے باعث انھوں نے لوگوں کے دلوں پر حکومت کی، بے پناہ
مقبولیت ومحبوبیت سے ہم کنار ہوئے۔ ادب میں بھی لافانی مقام حاصل کیا اور اپنے مخالفین
اور ناقدین سے بھی یہ اعتراف کرالیا ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اردو ادب میں غالبؔ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ عظیم فنکار
ہونے کے ساتھ وہ عظیم انسان بھی تھے، وہ دردمند دل کے مالک تھے، دوسروں کی تکلیف
سے بے چین ہوجانا ان کی کمزوری تھی۔ دکھیاروں اور مظلوموں کے درد اور اضطراب سے ان کا
دل بھر آتا تھا، وہیں اپنی تکلیفوں اور اذیتوں کو مسکراتے ہوئے جھیلنے پر یقین رکھتے تھے۔ یہی
وجہ ہے کہ ان کے ادب میں درد کے آنسو اور زندگی کی مسکان کی دھوپ چھاؤں دیکھنے کو ملتی ہے۔

اردو ادب میں غالبؔ اپنی شوخی، زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی کے باعث ایک ایسے فن کار
کے روپ میں سامنے آئے ہیں جس کی نظیر نہیں ملتی ان کے قلم سے شوخی کے پھول جھڑتے ہیں،
طنز کے تیروں سے سماج کے ناسوروں کا آپریشن کرتے ہیں، شگفتگی وظرافت سے مشکلوں کو آسان
کرنے کا کارنامہ انجام دیتے ہیں غالبؔ کی ذات اور فن، شوخی وظرافت، طنز ومزاح، گیرائی گہرائی
ندرت وجامعیت کا ایسا آئینہ ہے جس میں ہم سب اپنے اپنے ظرف اور ذوق کے مطابق دلکش
دلآویز اور رنگارنگ مرقع دیکھتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کے
ظاہر وباطن اور قول وفعل کے تضاد کو اجاگر کرتا ہوا ان کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے اور ان کے فن کی داد
دیجئے ؎

کہاں مے خانے کا دروازہ اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کہ کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

غالبؔ کا طنز ومزاح تلخ گوئی وتلخ کلامی سے بالکل پاک ہے۔ ان کی میٹھی میٹھی چٹکیاں دل کو
گدگدا کر جذبات کے تاروں کو چھیڑ دیتی ہیں اور پڑھنے یا سننے والے کو فرحت بخش کیف وسرور
سے سرشار کردیتی ہیں۔ ایک شعر میں محبوبہ کے حسن وجمال اور غرور ونخوت پر کیسا تیکھا طنز

کرتے ہیں ؎

آئینہ دیکھ اپنا سامنہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پر کتنا غرور تھا

غالبؔ کے طنز کا نشانہ خدا کو بھی نہیں بخشتا۔ نامۂ اعمال غیر کے ذریعہ لکھے جانے اور قصوروار قرار دیے جانے پر فرماتے ہیں ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

اور تو اور غالبؔ اپنے آپ پر بھی پھبتی کسنے سے نہیں چوکتے ؎

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

بڑی سے بڑی مصیبت بھی غالبؔ کی شوخ مزاجی اور زندہ دلی کو مجروح نہیں کر سکی۔ سنجیدہ سے سنجیدہ بات کو ظرافت کا لحاف اڑھا کر بیان کرنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ اپنے ایک عزیز شاگرد کی دوسری بیوی کے انتقال کی خبر پاکر، اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس پہلے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے اور نہ دم نکلتا ہے۔"

مرزا کی باغ و بہار اور رنگارنگ شخصیت اور ان کی شوخیاں نہ تو کسی دوسرے فن کار کے حصے میں آئیں اور نہ آسانی سے کسی کو حاصل ہو سکتی ہیں۔ اردو کے عظیم شاعر و ادیب مولانا عبدالباری آسیؔ رقم طراز ہیں۔

"مرزا کی عبارت اور تمام تر گفتگو لطیفہ ہوتی ہے اور ان کے حرف حرف کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لطیفۂ قدرت ہیں۔"

مولانا آسی کے اس قول کے آئینہ میں مرزا غالب کے چند لطیفے ملاحظہ کیجیے۔ آپ بھی داد دیے بنا نہ رہیں گے۔

ایک بار رمضان کا مہینہ ختم ہونے کے بعد مرزا قلعہ گئے۔ بہادر شاہ ظفر نے پوچھا کہیے مرزا صاحب آپ نے کتنے روزے رکھے؟"

"پیر و مرشد! ایک نہیں رکھا" غالب نے بے ساختہ جواب دیا۔

مرزا غالب کے ایک دوست و مشہور معالج حکیم رضی الدین خاں کو آم پسند نہ تھے پر مرزا آم پر جان چھڑکتے تھے۔ ایک دن حکیم صاحب مرزا کے گھر بیٹھے ہوئے تھے۔ گلی میں آم کے چھلکے پڑے ہوئے تھے اتنے میں ایک گدھے والا وہاں سے گزرا۔ ایک گدھے نے رک کر آم کے چھلکے سونگھے اور چل دیا۔

یہ دیکھ کر حکیم صاحب نے مرزا سے مسکراتے ہوئے کہا: "دیکھو مرزا تم آموں کی بڑی تعریف کرتے ہو مگر آم ایسی چیز ہے کہ اسے گدھے بھی نہیں کھاتے"

مرزا صاحب نے نہایت سنجیدگی سے فرمایا:

"جی ہاں! بے شک گدھے آم نہیں کھاتے"

ایک بار رات گئے دلی میں کسی مشاعرے یا دعوت سے مرزا مولانا فیض سہارنپوری کے ساتھ واپس آ رہے تھے راستے میں ایک اندھیری گلی سے ان کا گزر ہوا۔ وہاں ایک گدھا کھڑا دکھائی دیا۔ مولانا فیض نے یہ دیکھ کر پھبتی کسی:

"مرزا صاحب! دہلی میں گدھے بہت ہیں"

"نہیں صاحب! باہر سے آ جاتے ہیں" مرزا نے تپاک سے جواب دیا۔ مولانا جھینپ کر خاموش ہو گئے۔

ایک مرتبہ دہلی کے ادیبوں میں ایک لفظ "رتھ" کے مذکر یا مونث ہونے کی بحث چل رہی تھی۔ کسی نے غالب سے بھی رائے مانگی۔

"حضرت رتھ مونث ہے یا مذکر"

"بھیا جب رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مونث کہو اور جب مرد بیٹھے

ہوں تو مذکر" مرزا نے انھیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مرزا غالب کی شخصیت اپنے آپ میں اتنی صفات سمیٹے ہوئے تھی جسے الفاظ کے ذریعے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ طنز، مزاح، شوخی، ظرافت، زندہ دلی، شگفتہ مزاجی اور خوش مزاجی ان کی سدا بہار شخصیت اور لافانی ادب کا اہم جزو ہے۔ مرزا غالب کے ایک عزیز ترین شاگرد اور مشہور شاعر، ادیب و نقاد مولانا الطاف حسین حالیؔ نے انھیں خوبیوں کی بنا پر انھیں "حیوان ظریف" کے لقب سے یاد کیا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ غالب جیسا عظیم اور سدا بہار فن کار۔ اردو ادب کی تاریخ میں مشکل سے ہی پیدا ہوگا۔

ترجمہ ہندی تقریر
(آل انڈیا ریڈیو رام پور)

غالب کا حادثۂ اسیری

ادیب ہر دور میں اپنے دور کا ضمیر اور اپنے ضمیر کی آواز رہا ہے آزادئ فکر و خیال کو اس نے ہمیشہ اور ہر حالت میں عزیز رکھا ہے۔ احساس اور تخیل کی غیر معمولی قوت رکھنے کی وجہ سے اس نے اپنے عہد کی دکھی انسانیت کی جراحتوں اور اذیتوں کو اپنے سینے میں پوری شدت سے محسوس کیا ہے اور اپنے احساسات کو قدرت بیان سے لفظوں کا پیکر عطا کیا ہے۔ اگرچہ ضمیر کی آواز اور اظہار کی اس آزادی کے لیے اسے بڑی قیمت ادا کرنا پڑی ہے اس نے دار و رسن اور قید و بند کی صعوبتیں بھی اٹھائی ہیں اور فاقے بھی کیے ہیں لیکن وہ جنون کی "حکایات خوں چکاں" ہاتھ قلم ہونے کے باوجود لکھتا رہا ہے اور زنداں کی آہنی دیواروں کے پیچھے بھی اس نے ادب کی تخلیق کا مقصد اور مبارک کام جاری رکھا ہے۔ وہ چکی کی مشقت کے ساتھ ساتھ مشق سخن بھی کرتا رہا ہے اور اس نے قید تنہائی میں اپنے خون جگر سے کشت فن کی نمود کی ہے۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے بہ قول۔

> "جب ماضی اور مستقبل حال میں جذب ہو کر رہ جائیں، جب وقت تھم سا جائے جب امید کا ریگستان، مستقبل کے بالائی شیشے سے ماضی کے زیریں شیشے میں گرے یا اس کے برعکس، اور نتیجہ ایک ہی ہو۔ اس وقت لکھنے سے بہتر شغل اور کیا ہو سکتا ہے؟" [1]

کہا جاتا ہے کہ بیدار مغز انسان کے لیے قید کی تنہائی ایک نعمت غیر مترقبہ ہوتی ہے۔ دراصل جیل کا خاموش گوشہ ایک مفکر کے لیے الہامی دنیا سے کچھ کم نہیں۔ یہاں اس کے خیالات کی پرواز کے لیے غیر محدود فضا موجود ہوتی ہے۔ دنیا کی بعض بہترین تخلیقات انھیں گوشوں کے طفیل عالم وجود میں آئی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ کہ۔

"قید و بند ہو یا دار و رسن، یہ منزلیں بغیر غزل خوانی کے طے نہیں ہو سکتیں کولمبس رائیلے، گیلے لیو، برونونیں ______ گے ری سن، براؤن، لینن، بہادر شاہ ظفر، مہاتما گاندھی، نہرو، آزاد، حسرت موہانی، محمد علی، فیض احمد فیض سب نے اسی طرح اپنی اسیری کی تکلیف کو کم کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنے اثبات وجود کا اعلان کیا ہے۔" ؎

ایک مغربی مفکر کی رائے ہے کہ۔

"عام لوگ جب جلاوطن کئے جاتے ہیں یا قیدخانوں میں بند کیے جاتے ہیں تو اگر وہ زندہ بچ جاتے ہیں، مایوس اور مغموم رہتے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ادیبوں اور مصنفوں کو اسیری میں بڑا سکون اور اطمینان نصیب ہوتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ دنیا کی بعض بہترین کتابیں قیدخانوں میں لکھی گئی ہیں۔"

اردو کے ادیب و شاعر بھی ہمیشہ سے حریت، آزادی اور انقلاب کے علم بردار رہے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ ان اقدار کے لیے قربانیاں دی ہیں اور مصائب و آلام کا مقابلہ خندہ پیشانی سے کیا ہے۔ جیل خانوں کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں وطن کی محبت اور علم و ادب سے لگاؤ کا جذبہ، ان سے چھینا نہیں جا سکتا۔ جیل کی اونچی چہار دیواری اور تاریک کوٹھریوں کے اندر بھی انھوں نے تخلیق، آزادی اور حریت فکر کی شمعیں روشن رکھی ہیں۔ ان شمعوں سے نہ صرف ہمارے ادب بلکہ ہماری زندگی کے ایوان بھی جگمگا رہے ہیں۔ ہندوستانی تہذیب اس کے خدوخال اور اس کے پس منظر کے صحیح ادراک کے لیے اردو کے "زندانی ادب" کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی میں

اور اس کے بعد اردو کے بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے رسن و دار کی آزمائشوں کا سامنا کیا ہے اور حریت پسند تحریکوں میں سرگرم حصہ لیتے رہے ہیں اور جب کبھی استعمار پسند برطانوی حکومت نے ان کی زبان پر تالا ڈالنا چاہا ہے انھیں جیل خانوں میں ڈال کر ان کی آواز کو دبانا چاہا تو ان میں جوش و جنون اور بڑھ گیا ہے۔ انھوں نے صعوبتوں سے گھبرا کر اپنے فرائض سے کبھی پہلو تہی نہیں کی بلکہ زبانوں پر مہر لگنے کے بعد بھی اپنی انگلیاں خون دل میں ڈبو کر ضمیر کی آواز کو ضبط تحریر میں لاتے رہے ہیں۔

ادب کی تخلیق میں خود ادیب کے ذہنی افکار اس کی شخصیت، اس کے خیالات اور ذہنی سطح، نیز ماحول سے سمجھوتہ کر لینے کی اور اس کو اپنے میں سمو لینے کی صلاحیت بڑا رول ادا کرتی ہے۔ جیل خانے کے اندر ادیب کا رشتہ بیرونی دنیا سے کٹ جاتا ہے اور وہ تمام باتیں جو بیرونی اور آزاد دنیا سے متعلق ہوتی ہیں۔ جیل خانے کی چہار دیواری کے باہر ہی چھوٹ جاتی ہے۔ جیل کے اندر کی دنیا، تنہائی، خلوت اور بزم خیال سے عبارت ہوتی ہے۔ اور یہ فضا جو اس کی تخلیق میں ممدو معاون ہوتی ہے بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ ادب و شعر کی تخلیق ایک پیچیدہ نفسیاتی عمل ہے جس کا مکمل طور پر سائنسی تجزیہ ابھی تک ممکن نہیں ہو سکا۔ لیکن اتنی بات تو حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ شاعر کے خیالات اور باہری دنیا میں ایک آویزش جاری رہتی ہے۔ شاعر کی ذہنی دنیا بجائے خود "محشر خیال" ہوتی ہے اور وہ اس کا تنہا اور مطلق حکمراں ہوتا ہے جب کہ بیرونی دنیا اور سماج کے ترکیبی عناصر کسی فرد واحد کی پسند اور ناپسند آرزوؤں اور امنگوں کے پابند نہیں ہوتے اس لیے اگر قید و بند کے واقعات اگر براہ راست خود کسی عظیم اور اعلیٰ مقصد کے لیے جد و جہد کا نتیجہ نہیں تھے تب بھی احتیاط کے ساتھ ان واقعات کی چھان بین اور ان کے اثرات کا جائزہ لینا چاہیے۔ اس سلسلے میں غالبؔ کی اسیری کا واقعہ غالباً اس لیے بھی منفرد ہے کہ وہ کسی بڑی جد و جہد کا حصہ تو نہیں تھا لیکن خود شاعر کی انفرادی اور ذاتی زندگی میں ایک بڑا واقعہ تھا اور اس کے خیالات سوچنے کے طرز اور ان کی شاعری پر اثر ڈالا۔

غالبؔ کی اسیری کسی قومی و ملکی تحریک کے سلسلے کی نہ تھی لکہ ان کی گرفتاری کا واقعہ

اس لیے اہم سمجھا جاتا ہے کہ وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے ممتاز ادیب اور مشہور شاعر تھے لیکن ان کا ادیب یا شاعر ہونا خود کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ دنیا کے بہت سے ادیب و شاعر قید و بند کے حالات سے دوچار ہوئے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی گرفتاری کے اسباب اور نوعیتیں مختلف رہی ہیں۔ لیکن غالبؔ کو جس جرم کی پاداش میں قید ہوئی وہ بذات خود نہ تو باعث تعجب ہے اور نہ خلاف توقع۔ پر غالبؔ کے ایسے مشہور و معروف شاعر اور نثر نگار نے جس جرم کا ارتکاب کیا اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ وہ اگر اخلاقی قدروں کی حفاظت یا قومی و ملی تحریکوں میں شرکت کے جرم میں قید ہوتے تو ایک انسان کی حیثیت سے بھی انھیں وہی مرتبہ حاصل ہوتا جو ایک شاعر اور ادیب کی حیثیت سے انھیں حاصل ہے۔ لیکن غالبؔ قمار بازی کے جرم میں گرفتار ہوئے تھے۔ یہ ایک سماجی اور اخلاقی جرم کا ارتکاب ہے، جس سے ان کی شاعرانہ عظمت پر تو کوئی حرف نہیں آیا، لیکن ان کی شخصیت ضرور داغ دار ہو گئی، جس کا احساس غالبؔ کو ساری عمر بے چینی میں مبتلا کیے رہا۔

غالبؔ کو چوسر اور شطرنج کھیلنے کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ ان کے بچپن کا زمانہ لاڈ پیار، بے فکری اور ہر طرح کی آسائش میں بسر ہوا تھا۔ ان کا ربط ضبط بھی بے فکرے امیرزادوں سے رہا، جس کی بدولت ان میں بے راہ روی پیدا ہو گئی، جس کا اثر کسی نہ کسی صورت میں زندگی بھر باقی رہا۔ شطرنج اور چوسر اسی ماحول کی دین تھی۔

مولانا حالیؔ نے غالبؔ کے جرم کی نوعیت کچھ اس انداز سے بیان کی ہے کہ گویا یہ ایک معمولی واقعہ تھا۔ کوئی خاص بات نہ تھی اور غالبؔ محض تفریح طبع کے لیے چوسر اور شطرنج کھیلتے تھے اور برائے نام بازی بد لیا کرتے تھے۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ کو جوا کھیلنے کی لت پڑ چکی تھی۔ انھوں نے حصول زر کی خاطر اپنے مکان کو جوئے کا اڈہ بنا رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ جوا کھیلنا ایک اخلاقی اور سماجی جرم ہے۔ غالبؔ دلی کے معزز شہریوں میں شمار ہوتے تھے۔ انگریزی حکام سے بھی ان کے تعلقات بہت خوشگوار تھے، ان کی رسائی قلعہ معلی میں بھی تھی۔ اس لیے حکام شہر ان کی طرف سے چشم پوشی کرتے تھے۔ ایسے کوتوال آتے رہے جن سے غالبؔ کے تعلقات تھے۔ غالبؔ پر کسی قسم کا شبہ بھی نہیں کیا جاتا تھا لیکن یہ جرم

کب تک چھپ سکتا تھا۔ ۱۸۴۱ء میں ان کی قسمت کا ستارہ گردش میں آیا اور وہ قمار بازی کے جرم میں گرفتار کر لیے گئے۔ عدالت میں پیشی ہوئی۔ غالب اور ان کے ساتھیوں پر جرمانہ کیا گیا اور جرمانہ ادا نہ کرنے پر چار ماہ قید میں رہنے کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ غالب نے جرمانہ ادا کر کے اپنی گلو خلاصی کرائی اور سزا بھگتنے سے بچ گئے۔ لیکن جوئے کا چسکہ ان کو پڑ چکا تھا۔ اس نے ان کی آنکھیں نہ کھلنے دیں۔ پہلی گرفتاری کا ان پر کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ اور وہ قمار بازی کی عادت نہ چھوڑ سکے۔

عرصہ تک دہلی کے کوتوال مرزا خانی رہے جو خود فارسی کے شاعر تھے اور قتیل کے شاگرد تھے۔ غالب سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔ لیکن ۱۸۴۵ء میں دلی میں ایک نیا کوتوال مقرر ہو کر آیا۔ اس نے آتے ہی انسداد قمار بازی کی مہم شروع کر دی، وہ غالب کے شاعرانہ کمال اور مرتبہ سے واقف نہ تھا اس نے غالب کے گھر قمار بازی کی خبر سنی اور ایک دن دھاوا بول دیا۔ ۲۵ مئی ۱۸۴۷ء کو غالب دوبارہ گرفتار ہو گئے۔ مقدمہ کنور وزیر علی خاں مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوا۔ بہادر شاہ ظفر نے ریزیڈنٹ کے پاس سفارشی خط لکھا۔ رؤسا کی طرف سے بھی کوشش کی گئیں کہ کسی طرح مرزا بچ جائیں لیکن سب بے سود، ہونی ہو کر رہی۔ غالب کو چھ مہینے قید با مشقت اور دو سو روپے جرمانہ ادا کرنے کا حکم ہوا۔ جرمانے کی عدم ادائگی کی صورت میں مزید چھ ماہ قید اور اصل جرمانے کے علاوہ پچاس روپے ادا کرنے پر مشقت کی معافی دینے کی پیش کش ہوئی، لیکن غالب پورے چھ ماہ جیل میں نہیں رہے، تین ماہ کی سزا جھیلنے کے بعد سول سرجن کی سفارش پر رہا کر دیے گئے۔

غلام رسول مہر کا خیال ہے کہ عید الفطر بھی قید میں گزری تھی اگر چھ ماہ کی مدت جیل میں پوری ہو جاتی تو عید الاضحٰے بھی قید ہی میں گزرتی۔

> "۱۲۶۳ھ کی عید الفطر ۱۳ اگست ۱۸۴۷ء کو تھی اور عید الاضحٰے ۸ نومبر ۱۸۴۷ء کو ہوئی۔ اگر یہ درست ہے کہ وہ اواخر جون میں گرفتار ہوئے تو جولائی اگست اور ستمبر کے مہینے یقینی طور پر جیل میں گزرے۔" [۵۶]

غالب اواخر جون میں نہیں، اواخر مئی (۲۵ مئی ۱۸۴۷ء) میں گرفتار ہوئے تھے جس کی

تصدیق بہ قول مالک رام "طبقات الشعرار ہند" (صفحہ ۳۰۸) سے بھی ہوتی ہے لیکن تاریخ کا تعین فوائد الناظرین سے ہوا"۔ اس لیے غلام رسول مہر کا یہ دعویٰ کہ جولائی اگست اور ستمبر کے مہینے یقینی طور پر قید میں گزرے، مشکوک ٹھہرتا ہے۔

حادثۂ اسیری کے اسباب

غالبؔ کے حادثۂ اسیری کے متعلق ان کی تصانیف میں کوئی تفصیل نہیں ملتی ہے مولانا حالیؔ نے البتہ "یادگار غالبؔ" میں ان کی گرفتاری پر روشنی ڈالی ہے ان کے بقول غالبؔ نے اپنے ایک فارسی خط میں اس واقعہ کو اختصاراً لکھا ہے۔ یہ خط کلیات نثر میں نہیں ملتا ہے۔ مولانا حالیؔ نے اس خط کا جو اقتباس دیا ہے۔ اس کا مضمون یہ ہے:

"کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف، فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔ سشن جج باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا۔ اس نے بھی اغماض اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا گیا مگر کسی نے نہ سنا اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گزر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی کا آگیا اور حکام صدر نے ایسی رپورٹ بھیجنے پر اس کی تعریف کی۔ سنا ہے کہ رحم دل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفرین کی اور میری خاکساری و آزادہ روی سے اس کو مطلع کیا۔ یہاں تک کہ اس نے خود میری رہائی کی رپورٹ بھیج دی"۔ ۸ؔ

غالبؔ کا یہ فارسی خط مولانا امتیاز علی عرشی نے اپنے دیوان غالبؔ میں شائع کیا ہے جس کی عبارت درج ذیل ہے:

"شحنہ عدو بود و مجسٹریٹ با من ناآشنا۔ فتنہ در کمیں بود و بخت نارسا مجسٹریٹ

باآں کہ شحنہ رافرماں رواہستی درخستن من شحنہ رافرماں برودتوقیع من نوشت۔ وسشن جج باآں کہ بامن دوستی داشت وپیوستہ بامن مہرورزدمہرباں بود وبارہا دربزمِ مے بہم بیہودہ وچشم پوشید وبدمن تغافل زد۔ داوری بہ صدربروند ہیچ کس نہ شنید وہماں فرماں بے دادبجا ماند۔

زانم رواداد کہ چوں نیمہ میعادبسری شد مجسٹریٹ رادل بہم برآمد وخود ازصدر نسخ حکم خویش ورستگاری من خواہش دے پذیرفتند بلکہ اورا بدیں خواہش ثناگفتند'' ۹ۂ

مرزا غالبؔ کے اس خط سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود کو بے گناہ سمجھتے تھے۔ اور ان کو یقین تھا کہ ان کی گرفتاری اور گرفتاری کے بعد سزا ظلم ہی نہیں تھا بلکہ انصاف کا خون بھی تھا۔ مولانا حالؔی مرزا کے اس بیان پر کامل یقین رکھتے تھے۔ اپنے ممدوح کے دامن تقدس کو ان تمام آلودگیوں سے پاک صاف دیکھنا چاہتے تھے اور مرزا کی گرفتاری کو کوتوال کی دشمنی پر محمول کرتے تھے۔ اور دوسروں کو بھی اس بات کا یقین دلانا چاہتے تھے۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد نے مولانا حالؔی کی مدحت طرازی کی تردید ہی نہیں کی بلکہ پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ انھوں نے اس حقیقت کا اعلان بھی کیا ہے کہ مرزا کی گرفتاری کا سبب کوتوال کی دشمنی نہ تھی بلکہ یہ قماربازی کا کرشمہ تھا اور شہادت میں انھوں نے ایک ایسی شخصیت کو پیش کیا ہے جس سے زیادہ معتبر شہادت دینے والا دوسرا ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ شہادت علائی مرحوم کے صاحبزادے سر نواب امیرالدین احمد دوالئی لوہارو، کی شہادت ہے جو مرزا کے مکتوب الیہ بھی تھے۔ یہ شہادت صرف ان لفظوں پر ختم نہیں ہوتی کہ مرزا نے اپنے مکان کو جوا بازی کا اڈہ بنا رکھا تھا بلکہ مزید تفصیل میں قمار خانے کی پوری حقیقت سامنے آجاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ مرزا کے اس عمل نے دوستوں اور طبیبوں ہی میں نہیں بلکہ اعزا میں بھی نفرت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا اور انھوں نے بھی یک قلم آنکھیں پھیر لی تھیں اور لوہارو خاندان کے افراد اس بات میں شرمندگی محسوس کرنے لگے تھے کہ وہ مرزا کے عزیز وقریب تصور کئے جائیں۔

قمار بازی کے جرم میں غالبؔ کی گرفتاری ایک افسوس ناک سانحہ تھا، لیکن اس سلسلہ میں حکام پر یہ الزام لگانا کہ انھوں نے ناانصافی اور ہٹ دھرمی سے کام لیا اور غالبؔ پر جھوٹا مقدمہ قائم کر کے اپنے دل کی عداوت نکالی اور ان کے ساتھ بے رحمی کا ثبوت دیا، حقائق کو جھٹلانا اور انصاف کا خون کرنا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ غالبؔ عادی قمار باز بن چکے تھے اور ان کی قمار بازی، ایک فرد کی قمار بازی تک محدود نہیں تھی۔ اس کا اثر سارے سماج پر پڑ رہا تھا اور اس سماجی جرم کے نتیجے میں، انھیں جو سزا بھگتنا پڑی وہ حق بجانب ہے۔ اس وقت کی بعض تحریروں میں تو حکام کو اس بنا پر مبارک باد دی گئی ہے کہ انھوں نے غالبؔ کے مرتبہ کو اپنی فرض شناسی کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیا اور انصاف کے تقاضوں کو پورا کیا۔

بہ قول مالک رام اس زمانے میں قمار بازی کوئی غیر معمولی بات بھی نہیں تھی، کیونکہ اس زمانے میں خوش باش امیروں اور بے فکر رئیسوں کا یہ عام مشغلہ تھا اور کوئی پرسان حال نہ تھا لیکن جوں ہی کوئی سنجیدہ مزاج حاکم آجاتا یہی ہنسی کھیل کا سامان بلائے جال بن جاتا اور ان غریبوں کی شامت آجاتی۔ مرزا غالبؔ کا مکان بھی ان دنوں میں باقاعدہ قمار خانہ بن گیا تھا لوگ مرزا کے مکان پر جمع ہوتے تھے اور جوا کھیلتے تھے۔ حکام بھی ان حرکتوں سے چشم پوشی کرتے تھے۔ ۱۸۴۱ء میں نیا کوتوال متعین ہو کر آیا۔ وہ سخت مزاج کا تھا اور مرزا غالبؔ سے ناواقف۔ اس نے ایک دن مرزا کے مکان پر چھاپہ مارا اور انھیں بعض دوستوں سمیت کھیلتے میں گرفتار کر لیا اور پیشی پر عدالت نے سب کو جرمانہ کر دیا۔ چنانچہ مرزا کو بھی جرمانہ کی سزا ہوئی اور مزید یہ حکم ہوا کہ جرمانہ ادا نہ کریں تو چار مہینے قید میں رہیں بظاہر انھوں نے جرمانہ ادا کر کے گلو خلاصی کرائی۔" [۱۰]

مالک رام کے اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غالبؔ نے اس سماجی اور اخلاقی جرم کا ارتکاب عمداً کیا تھا۔ چوسر، شطرنج اور قمار بازی ان کی زندگی کا جزو بن چکی تھی۔ بچپن کا زمانہ تو عیش وعشرت اور بے فکری میں بیتا ہی تھا۔ جوانی میں بھی آوارہ مزاج اور عیش پسند امیرزادوں سے ان کا یارانہ تھا جس کی بدولت ان میں بے راہ روی پیدا ہو گئی تھی اور یہی بے راہ روی

ان کی ذلت و رسوائی کا سامان بن گئی۔ اور غالب کو قمار بازی کے جرم میں زنداں کی آہنی سلاخوں کے پیچھے قید کر دیا گیا۔

غالب کی قمار بازی

غالب کی شخصیت کا سب سے بڑا جوہر ان کی آزادہ روی تھا یہ خصوصیت ان کی شخصیت کی نقاب کشائی کرنے میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ غالب کی اردو اور فارسی شاعری اس بات کی شاہد ہے کہ بحیثیت فلسفی بھی غالب اعلیٰ مدارج طے کر چکے تھے۔ خود ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"خدا شاہد ہے اور خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا کہ اس نے ان باون برسوں میں معنی کے کتنے دروازے مجھ پر کھولے ہیں۔"

اور یہ محض دیوانے کی بڑ نہیں۔ دیوان غالب (اردو) و کلیات غالب (فارسی) میں بکھرے ہوئے کتنے ہی نازک دقیق اور پیچیدہ فلسفیانہ مسائل اس دعوے کا ثبوت بہم پہنچانے کے لیے موجود ہیں۔ پھر غالب کے تمام سوانح نگار اس پر متفق ہیں کہ غالب کو اپنے عہد کے تمام علوم مروجہ و علوم متداولہ میں دست گاہ کامل حاصل تھی۔ اور گو کہ وہ اول و آخر صرف شاعر تھے لیکن ان کا علمی منصب بہت بلند تھا۔ انھیں خاندانی شریف زادے ہونے کا شرف حاصل تھا۔ ان کا شمار رئیسوں میں کیا جانے لگا تھا۔ لیکن ان باتوں کے پیش نظر کو اس بات پر مزید غور کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ کون سے نفسیاتی عوامل تھے، جنھوں نے اس فلسفی شاعر اور عالم کو قمار بازی اور شراب نوشی پر مجبور کر دیا تھا۔

سید امیر حسن نورانی رقم طراز ہیں۔

"بچپن کا پورا زمانہ بے فکری اور ہر طرح کی آسائش میں بسر ہوا اسی لیے ربط و ضبط بھی بے فکرے امیرزادوں سے رہا، جس کی بدولت بے راہ روی پیدا ہوگئی جس کا اثر کسی نہ کسی صورت میں زندگی بھر باقی رہا۔"[۱۱]

بدقسمتی سے غالب کے عہد طفلی کے متعلق اول تو کچھ تفصیلات نہیں ملتیں اور اگر کچھ ملتی

ہیں تو انھیں سند کا درجہ حاصل نہیں ہے۔ اس لیے صرف قیاسات پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر مندرجہ بالا قیاس درست ہے تو عقل سلیم یہ بات قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی کہ بچپن کے وہ اثرات داخلی و خارجی تجربات کی وجہ سے زائل کیوں نہیں ہو گئے جنھوں نے غالبؔ کی فلسفیانہ اور ادبی شخصیت کی تعمیر کی تھی۔ بچپن کے ان اثرات کی اصلاح غالبؔ کی ایسی شخصیت والے انسان کے لیے چنداں مشکل امر نہیں تھا۔

اس سلسلہ میں یہ قیاس بھی لگایا جا سکتا ہے کہ غالبؔ کی شراب نوشی قمار بازی اور ان کی اس قبیل کی دوسری عادتیں فی الواقع سماجی اور قانونی جرائم کا ارتکاب کرنے کی حیثیت سے نہیں تھیں۔ ایک قدآور فلسفیانہ شخصیت رکھنے والا انسان طبعًا جرائم پیشہ نہیں ہو سکتا۔

غالبؔ ایک بلند ذہن رکھنے والا انسان ہونے کی حیثیت سے سماجی مسلمات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کی شاعری اور خطوط سے ایک آزادہ رو شخصیت سامنے آتی ہے۔ حضرت علیؑ کی تعریف سے لے کر شراب نوشی تک صرف یہی ایک قدر مشترک ہے، جس کو ہم آزادہ روی اور رند مشربی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اسی لیے غالبؔ نے جس دن داڑھی رکھی سر کے بال منڈوا دئے کیونکہ عام روش اس کے برخلاف تھی۔ شراب وہ اعلانیہ پیتے تھے۔ افطار صوم کی دستگاہ نہ ہونے کی وجہ سے روزہ کھاتے تھے اور یہ تمام باتیں ان کی ایسی شخصیت کی تعمیر کرتی ہیں جو فلسفہ کے ہر معیار سے تشکیک پسند ذہن رکھتی تھی اور اپنے قول و عمل میں مطابقت پیدا کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس زمانے میں سماجی نظام کے پہریدار غالبؔ کی اس "تلاش" کو جو بغاوت کی سرحدوں تک نہیں پہنچی تھی برداشت نہ کر سکے، اور انجام کار اس "رند مشرب" اور "قلندر" کو جیل خانے کی دیواروں کے پیچھے پہنچا دیا گیا۔

غالبؔ کی گرفتاری کا ذکر
(ہم عصر اخبارات و تصانیف میں)
دہلی اردو اخبار:

مرزا غالبؔ کی گرفتاری کی تفصیلات، خود غالبؔ کی تصانیف میں نہیں ملتیں لیکن اس دور

کے اخبارات اور معاصرانہ تصانیف میں ان کی گرفتاری کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ غالب کی گرفتاری کا ذکر سب سے پہلے "اردو اخبار" کے ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء کے شمارے میں "قمار بازان" کے عنوان کے تحت ملتا ہے۔

"سنا گیا ہے کہ ان دنوں تھانہ گذر قاسم خاں میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز مثل ہاشم خاں وغیرہ کے، جو سابق میں بڑی علتوں میں دورہ تک سپرد ہوئے تھے (گرفتار ہوئے ہیں) کہتے ہیں (کہ) بڑا قمار ہوتا تھا لیکن بہ سبب رعب و کثرت مرداں کے کسی طرح سے کوئی تھانیدار دست انداز نہیں ہو سکتا تھا اب تھوڑے دن ہوئے یہ تھانیدار، قوم سے سید اور بہت جری سنا جاتا ہے مقرر ہوا ہے۔ یہ پہلے جمعدار تھا۔ بہت مدت کا نوکر ہے۔ جمع داری میں بھی بہت گرفتاری مجرموں کی کرتا رہا ہے، بہت بے طمع ہے۔

یہ مرزا نوشہ نامی ایک شاعر نامی اور رئیس زادہ، نواب شمس الدین احمد خاں قاتل ولیم فریزر کے قرابت قریبہ میں سے ہے۔ یقین ہے کہ تھانیدار کے پاس بہت سے رئیسوں کی سعی و سفارش بھی آئی لیکن اس نے دیانت کو کام فرمایا۔ سب کو گرفتار کیا۔ عدالت سے جرمانہ علیٰ قدر مراتب ہوا۔ مرزا نوشہ پر سو روپے، نہ ادا کریں تو چار مہینے قید۔ لیکن اس علاقے میں بہت رشتہ دار متمول اس رئیس کے ہیں کچھ تعجب نہیں کہ بے وقت چوٹ پھٹ کریں اور یہ دیانت ان کی وبال جان ہو۔ حکام ایسے تھانے دار کو چاہیے کہ بہت عزیز رکھیں ایسا آدمی کم یاب ہوتا ہے۔"[۱۲]

اخبار "مہر منیر" کلکتہ

اخبار مہر منیر کلکتہ کی ۲ ستمبر ۱۸۴۱ء کی اشاعت میں "شاعر نامدار دہلی" کے عنوان سے لکھا ہے۔

"از اخبار دہلی واضح شد کہ از مکان میرزا نوشہ، شاعر نامدار دہلی یکے از عزیزان نواب

شمس الدین خاں مرحوم تنے چند مقامران نامدار کہ در لیل و نہار بجز قمار دیگر کار نداشتند، در حالت مقامرت بسعی تھانے دار اسیر و گرفتار شدند و بر محکمہ حاکم حاضر گردیدند حاکم نصفت شعار یک صد روپیہ و از دیگراں سی سی روپیہ جرمانہ گرفتہ آزاد فرمود۔" ؎۱۳

مذکورہ بالا اقتباسات سے ثابت ہوتا ہے کہ غالب پہلی بار ۱۸۴۱ء میں گرفتار ہوئے اور رہا کر دئے گئے۔ ۱۸۴۷ء میں وہ اس جرم میں دوبارہ پکڑے گئے اور انھیں قید و مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔

احسن الاخبار بمبئی

"دہلی ۔ ۱۵ رجمادی الثانی مرزا اسداللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث گرفتار کرلیا گیا معظم الدولہ بہادر کے نام سفارشی چٹھی لکھی گئی۔ دیہ چٹھی بادشاہ نے لکھی تھی، کہ ان کو رہا کردیا جاوے یہ معززین شہر میں سے ہیں، یہ جو کچھ ہوا محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔ عدالت فوج داری سے نواب صاحب کلاں بہادر نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے۔ ایسی حالت میں قانون سفارش کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔" ؎۱۴

بادشاہ کی سفارش کارگر نہ ہوئی اور مرزا کو قید اور جرمانے کا حکم سنا دیا گیا چنانچہ اسی اخبار کی اشاعت مورخہ ۲۰ جولائی ۱۸۴۷ء میں لکھا ہے۔

مرزا اسداللہ غالب پر عدالت فوج داری میں جو مقدمہ دائر تھا اس کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید بامشقت اور دو سو روپے جرمانے کی سزا ہوئی اگر دو سو روپے جرمانہ ادا نہ کریں تو چھ ماہ قید میں اور اضافہ ہوجائے گا۔ مقررہ جرمانے کے علاوہ اگر پچاس روپے زیادہ ادا کیے جائیں تو مشقت معاف ہوجائے گی۔ جب اس بات پر خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عرصہ سے علیل رہتے ہیں۔ سوائے پرہیزی غذا قلیہ چپاتی کے اور چیز نہیں کھاتے تو کہنا پڑتا ہے کہ اس قدر مشقت اور مصیبت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے

باہر ہے بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اگر سشن جج کی عدالت
میں اپیل کی جائے اور اس مقدمہ پر نظر ثانی ہو تو نہ صرف یہ سزا موقوف ہو جائے
بلکہ عدالت فوجداری سے مقدمہ اٹھا لیا جائے۔

یہ بات عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے باکمال رئیس
کو جس کی عزت و حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے۔ معمولی جرم میں
اتنی سزا دی جائے جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہے" ۱۵ے

تذکرہ شعرائے اردو

مولوی کریم الدین نے اسی سال ایک "تذکرہ شعرائے اردو" لکھا تھا جس سال غالب پر قید و بند
کی مصیبت آئی تھی۔ اس تذکرہ میں غالب کی گرفتاری پر صرف اتنا لکھا ہے:

"ان ایام میں یعنی درمیان ۱۸۴۷ء کے، ایک حادثہ ان پر جانب سرکار سے پڑا۔
جس کے سبب ان کو بہت رنج لاحق ہوا عمر ان کی اس سال قریب ساٹھ سال کے
ہوگی" ۱۶ے

آبِ حیات

مولانا محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں غالب کی قید کا کوئی سبب نہیں لکھا ہے صرف
یہ اشارہ کیا ہے کہ۔

"حضرت یوسف کی طرح مرزا صاحب کو بھی چند روز قید میں رہنا پڑا" ۱۷ے

چراغِ دہلی

مرزا حیرت دہلوی نے "چراغ دہلی" میں لکھا ہے۔

"ایک مرتبہ مرزا صاحب قمار بازی کی علت میں گرفتار ہوئے تھے۔" ۱۸ے

دیوانِ عاصی دہلوی

نصیر کے ایک شاگرد منشی گھن شیام داس عاصی دہلوی کا دیوان "کائستھ اردو سبھا" دہلی کی جانب سے شائع ہوا ہے۔ اس میں "تاریخ گرفتاری مرزا غالب" کے عنوان کے تحت ایک قطعۂ تاریخ اور چند جملے درج ہیں۔ جس سے غالب کے واقعۂ قید پر کسی قدر روشنی پڑتی ہے۔ عاصی کا قطعۂ تاریخ یہ ہے ۔

سر ابجد سے فضلی میں تو سب اظہار طوفاں ہے
اور اٹھارہ سو سینتالیس قید غریباں ہے

غالب کی گرفتاری کے واقعہ پر عاصی نے لکھا ہے ۔

"مرزا نوشہ شاعر بے بدل، رند مشرب، المتخلص بہ اسد و غالب سے فیض الحسن خاں کوتوال دہلی کو ناحق عداوت پیدا ہوگئی اور اس نے بعلت قمار بازی ان کو قید کرادیا ۔ ۔ ۔ ۔ بروقت گرفتاری کوتوال صاحب رتھ میں بیٹھ کر موقع پر گئے اور ظاہر کیا کہ سواریاں زنانی آئی ہیں۔ اس دھوکے سے اندر داخل ہوگئے اور اندر مکان کے ضربات جوتی باہم اس قدر ہوئیں کہ باہر تک آواز آتی تھی مگر زینے کے اندر بہت جمعیت تھی اور کچھ امدادی برقی انداز پہنچ گئے، گرفتار کر کے قید کرادیا، بہت سے رئیس و شرفا اس حرکت سے ناراض تھے اور عدالت میں برائت کے مساعی ہوئے مگر قید ہوگئی ۔

ایک روز مسٹر راس صاحب سول سرجن دہلی قیدیان جیل خانہ کو ملاحظہ کرتے کرتے حضرت کے پاس پہنچ گئے اور حال دریافت کیا، آپ نے فی البدیہہ فرمایا ؎

جس دن سے کہ غمزدۂ زنجیر بپا ہیں!
کپڑوں میں جوئیں بخیئے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

اسی وقت ڈاکٹر صاحب نے گورنمنٹ کو چٹھی لکھ کر رہا کرادیا۔" [۱۹]

غالب کی اسیری پر مولانا آزاد کی رائے

خواجہ حاؔلی مرحوم نے اس واقعہ کی نسبت جو کچھ لکھا ہے وہ حقیقت کے خلاف ہے خواجہ مرحوم سوانح نگاری کو محض مدحت طرازی سمجھتے تھے۔ اس لیے پسند نہیں کرتے تھے کہ ناگوار واقعات کو ابھرنے دیا جائے۔

خواجہ صاحب نے اس معاملہ کو اس رنگ میں ظاہر کیا ہے کہ کوئی بات نہ تھی محض چوسر اور شطرنج کا شوق تھا۔ اس شوق کی تکمیل کے لیے برائے نام کچھ بازی بھی بدلیا کرتے تھے۔ کوتوال چوں کہ دشمن تھا اس لیے قمار بازی کا مقدمہ بنا دیا۔ حالاں کہ اصلیت بالکل اس کے خلاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پورا قمار بازی کا معاملہ تھا اور نواب امیرالدین مرحوم کے لفظوں میں "مرزا نے اپنے مکان کو جوا بازی کا اڈہ بنا رکھا تھا"

جو تفصیلات مجھے سر امیرالدین مرحوم سے معلوم ہوئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

غدر سے پہلے مرزا کی آمدنی کا وسیلہ صرف سرکاری وظیفہ اور قلعے کے پچاس روپے تھے چوں کہ زندگی رئیسانہ بسر کرنی چاہتے تھے اس لیے ہمیشہ مقروض اور پریشان حال رہتے تھے اس زمانے میں دہلی کے بے فکر رئیس زادوں اور چاندنی چوک کے بعض جوہری بچوں نے گزران وقت کے جو مشغلے اختیار کر رکھے تھے۔ ان میں ایک قمار بازی مشغلہ تھا گنجفہ عام طور کھیلا جاتا تھا اور شہر کے کئی دیوان خانوں کی مجلسیں اس باب میں شہرت رکھتی تھیں۔ مرزا بھی اس کے شائق تھے۔ رفتہ رفتہ ان کے یہاں چاندنی چوک کے بعض جوہری بچے آنے لگے اور باقاعدہ جوا بازی شروع ہوگئی۔ قمار کا عام قاعدہ ہے کہ صاحب مجلس دیا یوں کہیے کہ مہتمم قمار خانہ کا ایک خاص حصہ ہر بازی میں ہوا کرتا ہے۔ جو بھی جیتے، فی صدی اتنا صاحب مجلس کا ہوگا۔ مرزا صاحب کے دیوان خانے میں مجلسیں جمنے لگیں تو وہ صاحب مجلس ہو گئے۔ اور ایک اچھی خاصی رقم بے محنت و مشقت وصول ہونے لگی، وہ خود بھی کھیلتے تھے اور چوں کہ کھلاڑی تھے اس لیے اس میں کچھ نہ کچھ مار ہی لیتے تھے۔

انگریزی قانون اسے جرم قرار دیتا تھا۔ لیکن شہر کی یہ رسم ٹھہر گئی تھی کہ رئیس زادوں کے

دیوان خانے مستثنیٰ سمجھے جاتے تھے۔ گویا ان کی وہ نوعیت مان لی گئی تھی جو آج کل کے کلبوں میں برج کھیلنے کی ہے۔ انھیں ازراہ تجاہل رئیسانہ تفریحوں کے ذیل میں تصور کیا جاتا تھا۔

عرصے تک شہر کے کوتوال اور حکام ایسے لوگ رہے، جن سے مرزا غالبؔ کی رسم و راہ رہتی تھی اس لیے ان کے خلاف نہ تو کسی طرح کا شبہ کیا جاتا تھا، نہ قانونی اقدام کا اندیشہ تھا انھیں میں ایک کوتوال، قتیل کے شاگرد میرزا خانی تھے جن کی نسبت خواجہ نصیر نے کہا تھا ؎

نصیر الدین بیچارہ تو رستہ طوس کا لیتا
نہ ہوتے شحنۂ دہلی اگر یاں میرزا خانی ۲۰ے

یہ میرزا خانی پھر لکھنؤ میں مقیم ہو گئے تھے۔ میرے عزیز دوست مرزا محمد عسکری لکھنوی انھیں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ غالباً وہ ان کے جد تھے۔

لیکن غالباً ۱۸۴۵ء میں آگرہ سے تبدیل ہو کر ایک نیا کوتوال آیا۔ یہ میرزا خانی کی طرح نہ تو شاعر تھا نہ نثر طراز کہ غالبؔ کا قدرشناس ہوتا۔ نیا کوتوال تھا۔ اس نے آتے ہی سختی کے ساتھ دیکھ بھال شروع کر دی اور جاسوسی لگا دیے۔ حکام سے قول لے لیا تھا کہ جب تک میرا کوئی جرم ثابت نہ ہو میرے معاملات میں مداخلت نہ کی جائے، ورنہ میں شہر کو جرائم سے پاک نہیں کر سکوں گا۔ اس زمانے میں بعض دوستوں نے مرزا غالبؔ کو بار بار فہمائش کی کہ ان مجلسوں کو ملتوی کر دیں لیکن وہ خبردار نہ ہوئے۔ وہ اس زعم میں رہے کہ میرے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جا سکتی۔ بالآخر ایک دن عین ایسے موقع پر کہ مجلس قمار گرم اور روپوں کی ڈھیریاں چنی ہوئی تھیں کوتوال پہنچا اور دروازے پر دستک دی اور لوگ تو پچھواڑے سے نکل بھاگے صاحب مکان یعنی مرزا صاحب دھر لیے گئے۔ مرزا صاحب کی گرفتاری سے پہلے چند جوہری پکڑے گئے تھے، مگر روپیہ خرچ کر کے بچ گئے تھے۔ مقدمہ تک نوبت نہیں پہنچی۔ مرزا کے پاس روپیہ کہاں تھا؟ ہاں اعزا و احباب تھے۔ انھوں نے بادشاہ سے سفارش کرائی مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا تو گھر میں بیٹھ رہے کوتوال سخت آدمی تھا حکام کو دہلی آتے ہی سازگار بنا چکا تھا اور عدم مداخلت کا اقرار لے چکا تھا۔ سفارشوں سے کوئی بات بننے والی نہ تھی۔

اس سلسلے میں واقعہ کا ایک پہلو نہایت عبرت انگیز ہے، جس کی تفصیلات مجھے خواجہ

حالی مرحوم سے معلوم ہوئیں۔ جونہی مرزا گرفتار ہوئے اور رہائی کی طرف سے مایوسی ہوگئی، نہ صرف دوستوں اور جلیسوں نے بلکہ عزیزوں نے بھی یک قلم آنکھیں پھیرلیں اور اس بات میں شرمندگی محسوس کرنے لگے کہ مرزا کے عزیز و اقارب تصور کیے جائیں۔ اس باب میں لوہارو کے خاندان کا جو طرزِ عمل رہا وہ نہایت افسوس ناک تھا۔ میں نے نواب امیرالدین مرحوم سے اشارتًا تذکرہ کرکے ٹٹو لنا چاہا تو ان کے جواب سے بھی اس کی پوری تصدیق ہوگئی۔

اس خاندان کا کوئی فرد نہ تو اس زمانے میں مرزا سے ملا اور نہ کسی طرح کی اعانت کی اتنا ہی نہیں بلکہ جب آگرہ کے ایک اخبار نے مرزا کا ذکر کرتے ہوئے انھیں خاندان لوہارو کا رشتہ دار ظاہر کیا تو یہ بات، ان لوگوں پر شاق گزری اور بہ اہتمام و تکلف اس کی تغلیط کرائی۔ یہ لکھوایا گیا کہ مرزا صاحب سے خاندان لوہارو کا کوئی نسبی تعلق نہیں ہے محض دور کا سببی تعلق ہے۔

نواب ضیاءالدین پر مرزا کو جس قدر ناز تھا وہ ان کے قصیدے سے ظاہر ہے۔

منم خزینہ راز و در خزینہ راز
ضیاء دین محمد، کہیں برادر من
اگرچہ اوست ارسطو و من فلاطونم
بوذ بہ پایہ ارسطوئے من سکندرِ من

لیکن نہایت افسوس کے ساتھ یہ واقعہ لکھنا پڑتا ہے کہ انھوں نے بھی آنکھیں پھیرلیں اور اسے کسرِ شان سمجھا کر قید خانے میں ایک اسیر جرم سے ملنے جائیں۔

لیکن بے مہری اور حق فراموشی کے اس عام منظر میں صرف ایک شخص کا چہرہ درخشندہ نظر آتا ہے۔ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ، خواجہ حالی مرحوم کہتے ہیں کہ جوں ہی انھیں اس واقعہ کی اطلاع ملی، فورًا ایک ایک حاکم سے جاکر ملے اور مرزا کی رہائی کے لیے پیہم کوششیں کیں پھر جب مقدمہ چلا اور اس کی اپیل کی گئی تو اس کے تمام مصارف اپنے پاس سے ادا کیے۔ جب تک مرزا قید خانے میں رہے، ان کا معمول تھا کہ ہر دوسرے دن سوار ہوکر قید خانہ میں جانا اور مرزا سے ملاقات کرنی وہ لوگوں سے کہتے تھے۔

" مجھے مرزا سے عقیدت ان کے زہد و اتقا کی بنا پر نہ تھی فضل و کمال کی بنا پر تھی،

جوئے کا الزام آج عائد ہوا، مگر شراب پینا تو ہمیشہ سے معلوم ہے، پھر محض اس الزام و گرفتاری کی وجہ سے میری عقیدت کیوں متزلزل ہو جائے؟ گرفتاری کے بعد بھی ان کا فضل و کمال ایسا ہی ہے جیسا پہلے تھا۔"

غالبؔ کہاں اسیر ہوئے

مرزا غالبؔ جس قید خانے میں رکھے گئے تھے وہ دہلی دروازے کے باہر مہندیوں کے قبرستان کے پاس تھا، اب اس جگہ کی تمام عمارتیں تقریباً مسمار ہو چکی ہیں اور یہاں مولانا آزاد میڈیکل کالج کی پرشکوہ عمارت کھڑی ہے۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے:

"۱۹۲۳ء میں جب میں دہلی سنٹرل جیل میں اسیر تھا تو مجھے ایک دن یہ خیال ہوا کہ کیا مرزا غالبؔ اسی قید خانہ میں رکھے گئے تھے۔ آصف علی صاحب سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ غدر سے پہلے بھی قید خانہ یہی تھا۔ یقیناً اسی احاطے کے کسی حصے میں اسیر رہے ہوں گے۔ بعد کو تفتیش کی تو معلوم ہوا یہاں پہلے بھولی بھٹیاری کی سرائے تھی بھٹیاری کو بعض تو بھٹیاری ہی سمجھتے ہیں، بعض بخاری کی تخریب سمجھتے ہیں۔ فتح دہلی کے بعد انگریزی حکومت نے سرائے کو قید خانہ بنا دیا اور پھر مزید عمارتوں کا اضافہ ہوتا رہا۔ وسطی عمارت جو ہم لوگوں کو دی گئی تھی واقعی قدیم طرز کی معلوم ہوتی ہے اور ٹھیک سرائے کی طرح ہے۔ غدر سے پہلے اس کے سوا کوئی قید خانہ نہ تھا۔ اس لیے تمام قیدی یہیں رکھے جاتے ہوں گے اور مرزا غالبؔ نے کہا ہوگا۔

ہلہ دُر دان گرفتار و فانیست شہر\
خویشتن را بہ شما ہمدم و ہمراز کنم

بھولی بھٹیاری کے متعلق شیخ اکرام کا خیال یہ ہے:

یہ بخاری یا فرید بخاری کی تخریب ہے۔ کم از کم اتنا یقینی ہے کہ یہ سرائے نواب مرتضیٰ خاں المعروف شیخ فرید بخاری نے تعمیر کرائی۔ جس سال مرزا غالبؔ قید ہوئے

اسی سال یا اس سے ایک سال پہلے سرسید کی کتاب "آثار الصنادید" شائع ہوئی جس میں انھوں نے تصریح کی ہے کہ شیخ بخاری کی سرائے میں اب جیل خانہ ہے"[۲۲]

سرسید نے اپنی کتاب "آثار الصنادید" میں اس سرائے کے بارے میں یہ تحریر کیا ہے کہ:

"جیل خانہ یا سرائے فرید خاں: درحقیقت یہ سرائے ہے نواب فرید خاں جہانگیری المخاطب بہ مرتضیٰ خاں کی بسائی ہوئی۔ ۱۰۱۷ھ مطابق ۱۶۰۸ء کے انھوں نے یہ سرائے بنائی تھی۔ جب پرانی دلی ویران ہوگئی یہ سرائے بھی ویران پڑی رہی۔ سرکار انگریزی نے اس کی مرمت کی اور اس کو جیل خانہ تجویز کیا"[۲۳]

غالب نے اپنے ترکیب بند میں یہ تفصیل بیان کی ہے کہ جس کوٹھری میں انھیں رکھا گیا تھا وہ "خشت و گل" سے بنی ہوئی تھی۔ نیز دو سپاہی پہرہ دیتے تھے۔

لرزہ از خوف دریں حجرہ کہ از خشت و گل است
ورنہ در دل خطر از کام نہنگم نبود
زیں دو سرہنگ کہ پوئند بہم می ترسم
بیمے از شیرو ہراسے ز پلنگم نبود

قدیم جیل خانے کی عمارت کی بعض تصاویر "اردوئے معلیٰ"، غالب نمبر (شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی) میں شائع ہو چکی ہیں۔

اسیری میں غالب کی کیفیت

غالب کے لیے اسیری کی سزا بہت سخت تھی۔ ان کے احباب و اعزا کا خیال تھا کہ چونکہ ان کی صحت خراب ہے اس لیے اتنی سخت سزا برداشت نہ کر سکیں گے مگر غالب نے اس حادثے کو چار و ناچار برداشت کیا وہ تین ماہ جیل میں رہے اور پچاس روپے ادا کر کے مشقت سے بچ گئے تھے۔ حالی نے قید کے حالات میں جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جیل خانے میں ان کی حالت محض نظر بند کی سی تھی اور انھیں تمام آسانیاں حاصل تھیں۔ کھانا کپڑا اور دوسری چیزیں حسب ضرورت ان کے گھر سے آتی تھیں۔ دوست احباب بے تکلف اور

بے روک ٹوک آتے جاتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ واقعہ مرزا پر بہت شاق گزرا تھا اگرچہ من جملہ چھ مہینے کے تین مہینے جو ان کو قیدخانے میں گزرے ان کو کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوئی۔ وہ قید خانے میں اسی آرام سے رہے جیسے وہ گھر پر رہتے تھے۔ کھانا اور کپڑا اور تمام ضروریات حسب دل خواہ گھر سے ان کو پہنچتی تھیں۔ ان کے دوست ان سے ملنے جاتے تھے اور وہ صرف بطور نظر بندوں کے جیل خانے کے ایک علیحدہ کمرے میں رہتے تھے مگر چونکہ اس وقت تک شہر کے شرفا و اعیان کے ساتھ اس قسم کا سلوک مرزا نے نہیں دیکھا تھا اس لیے وہ اس کو بڑی بے آبروئی کی بات سمجھتے تھے۔"[۲۴]

حالی کا یہ بیان یا تو سنی سنائی باتوں پر مبنی ہے یا محض غالب سے خوش عقیدگی کی بنا پر یہ سب لکھ دیا ہے کیونکہ اس کی تردید خود ان کے اس بیان سے ہو جاتی ہے جو انھوں نے مولانا آزاد کے استفسار پر دیا ہے۔

"اس سلسلے میں واقعہ کا ایک پہلو عبرت انگیز ہے جس کی تفصیلات مجھے خواجہ حالی سے معلوم ہوئیں، جونہی مرزا گرفتار ہوئے اور رہائی کی طرف سے مایوسی ہوگئی نہ صرف دوستوں اور ہم جلیسوں نے بلکہ عزیزوں نے بھی یک قلم آنکھیں پھیر لیں اور اس بات میں شرمندگی محسوس کرنے لگے کہ مرزا کے عزیز و قریب تصور کیے جائیں۔ اس باب میں لوہارو خاندان کا جو طرز عمل رہا وہ نہایت افسوسناک تھا۔ میں نے نواب امیر الدین مرحوم سے اشارۃً تذکرہ کر کے ٹٹولنا چاہا تو ان کے جوابات سے بھی اس کی پوری تصدیق ہو گئی۔"[۲۵]

قید میں غالب کو جو تکلیفیں ہوئیں ان کا اظہار اس حبسیہ سے ہوتا ہے جو انھوں نے قید کے حالات سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ قید کے دوران ان کے احباب نے بے رخی اختیار کر لی تھی، کوئی خبر لینے والا نہ تھا۔ اعزا تو ان سے اپنا تعلق ظاہر کرنا بھی کسر شان سمجھتے تھے غالب کو ان باتوں کو شدت سے احساس تھا:

شادم از قید کہ از بند معاش آزادم
از کف شحنہ رسد جامہ و نانم در بند

غالبؔ نے ترکیب بند میں اپنے مہربانوں و نامہربانوں کے نام تو نہیں لیے ہیں لیکن بعض اشعار میں اس طرف اشارے ضرور کئے ہیں :

ہمدماں در دلم از دیدہ نہا یند ہمہ
غالبؔ غم زدہ را روح و روا بند ہمہ
بسکہ خویشاں شدہ بیگانہ ز بدنامیِ من
غیر نہ شگفت خورد گر غم ناکامیِ من
جور اعدا رود از دل بہ رہائی لیکن
طعنہ احباب کم از زخم خدنگم نہ بود

قید و بند کے زمانے میں جب کہ غالبؔ کے احباب اور اعزا نے آنکھیں پھیر لی تھیں اس وقت صرف نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے حقیقی دوستی اور کرم فرمائی کا حق ادا کیا اور انھوں نے غالبؔ کی اعانت غم خواری اور دوست نوازی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ۔ اسی وجہ سے غالب نے جا بجا شیفتہ کا ذکر خاص طور سے کیا ہے بلکہ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ شیفتہ جیسا غم خوار دوست عزاداری کے لیے موجود ہو تو مرنے کا بھی غم نہیں :

خود چرا خون خورم از غم کہ بہ غم خواریِ من
رحمتِ حق بہ لباسِ بشر آمد گوئی
خواجہ ہست دریں شہر کہ از پرسشِ وے
پایہ خویشتم در نظر آمد گوئی
مصطفیٰ خاں کہ دریں واقعہ غم خوارِ من است
گر بمیرم چہ غم از مرگ عزادارِ من است

غالبؔ کو بھی اس سچے دوست کی محبت و خلوص کا پورا احساس تھا ۔ مدحیہ قصیدہ شیفتہ کی تعریف میں ہے ۔ اس میں بھی واقعہ قید کی طرف لطیف اشارہ ملتا ہے ؎

بشنو د بے آنکہ باد آں را بُرد
نالہ گر در کنج زنداں می زنم!
بشنود بے آنکہ کلک آں را کشد
نقش گر بر صفحۂ جاں می زنم

ان اشعار سے بھی خواجہ حالی کے بیان کی تردید ہوتی ہے کیوں کہ اگر دوست اقارب ان کی خبر گیری کرتے تو غالب ان کا ذکر ضرور کرتے بخلاف اس کے انھوں نے اپنے حبسیہ میں دوستوں کی بے مہری کا گلہ کیا ہے۔ صرف نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی ہمدردی کو سراہا ہے۔ اور اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے اس کس مپرسی کے عالم میں بھی اپنی دوستی اور شرافت کا ثبوت دیا۔ اس تعریف اور اشاروں کو خوشامد پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ لیکن شیفتہ کے اس طرز عمل اور حسن سلوک کی بنیاد مرزا کے فضل و کمال پر تھی اور وہ لوگوں سے کہتے بھی تھے کہ۔

"مجھے مرزا سے عقیدت ان کے زہد و اتقار کی بنا پر نہ تھی، فضل و کمال کی بنا پر تھی، جوئے کا الزام آج عائد ہوا مگر شراب پینا ہمیشہ سے معلوم ہے۔ پھر اس الزام وگرفتاری کی وجہ سے میری عقیدت کیوں متزلزل ہو جائے؟ گرفتاری کے بعد بھی ان کا فضل و کمال ویسا ہی ہے جیسا پہلے تھا۔" [۲۶]

شیفتہ کی اس سچی دوست نوازی اور قدر افزائی کا مرزا غالب کے دل پر جو اثر پڑا وہ ان کے ترکیب بند سے ظاہر ہے لیکن ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد شیفتہ کی گرفتاری نے مرزا کو بھی بے چین کر دیا۔ اور انھوں نے ان کی رہائی کے لیے جو جتن کیے اور پاپڑ بیلے۔ اس سے مرزا کی حق شناسی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور شیفتہ کی رہائی عمل میں آئی تو وہ اپنے جوش محبت پر قابو نہ پا سکے اور ڈاک کی سواری سے میرٹھ جا کر اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا، اس کے مقابلے میں عزیزوں اور رشتہ داروں کی سرد مہری یقیناً حیرت انگیز ہے۔ سب سے زیادہ تعجب نواب ضیاء الدین کی سرد مہری پر ہے کہ جن پر مرزا کو اس درجہ ناز تھا کہ ان کی مدح میں قصیدہ لکھتے ہوئے کہتے ہیں:

منم خزینہ راز و در خزینہ راز
ضیاء دین محمد کہیں برادر من

اگرچہ اوست ارسطو و من فلاطونم
بود بہ پایہ ارسطوئے من سکندر من

ان حقائق کو پیش نظر رکھا جائے تو اس سے شیفتہ کی دوست نوازی کی قدر و منزلت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

"آب حیات" میں مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ جب مرزا صاحب جیل میں تھے تو ان کے کپڑوں میں جوئیں پڑ گئی تھیں۔ ایک دن وہ بیٹھے ہوئے اپنے کپڑوں سے جوئیں نکال رہے تھے کہ ایک معزز رئیس ان سے ملاقات کرنے کے لیے پہنچے اس وقت غالب نے یہ شعر برجستہ پڑھا۔

ہم غم زدہ جس دن سے گرفتار بلا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں [۲۷]

یہ شعر بعض حضرات نے غالب کے غیر مطبوعہ کلام میں شامل کیا ہے۔ نظامی بدایونی "شرح کلام غالب" نے بھی اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ لیکن اس کی صحت مشتبہ ہے۔ غلام رسول مہر کا خیال ہے کہ:

"یہ شعر غالب کا نہیں ہے۔ اس سے قطع نظر شعر کی شانِ نزول قطعاً ناقابل قبول ہے اگرچہ خواجہ حالی کے ارشاد کے مطابق قید میں ان کی حیثیت محض نظر بند کی تھی یا پچاس روپے ادا کر کے مشقت معاف کرائی گئی تھی تو بے یاری و درماندگی کی یہ حالت کیوں کر قرین قیاس سمجھی جا سکتی ہے کہ غالب کے کپڑوں میں جوئیں ہو گئی تھیں اور ایک رئیس ملاقات کے لیے آیا تو وہ جوئیں نکال رہے تھے علاوہ بریں وہ رئیسوں میں شمار ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ وقت کے بادشاہ نے ان کی رہائی کے لیے سفارش کی تھی۔ لہٰذا جو صورت اس شعر میں پیش کی گئی ہے وہ ہر اعتبار سے مستبعد ہے۔" [۲۸]

مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں یہ بھی لکھا ہے کہ غالب جس دن جیل سے رہا ہوئے تو لباس تبدیل کیا اور جیل کا کرتا وہیں پھاڑ کر پھینک دیا اور برجستہ یہ شعر پڑھا۔

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

یہ واقعہ بھی من گڑھت معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے۔

غالبؔ پر حادثۂ اسیری کے اثرات

غالبؔ کی زندگی پر واقعۂ اسیری کا شدید اثر پڑا ہے۔ ان کی زندگی میں تین اہم موڑ آئے ہیں۔ ایک آغاز شباب کا زمانہ جب انھوں نے اپنی ذہنی منزل متعین کی اور ان کے خیالات میں وسعت، ہمہ گیری آزاد خیالی اور منفرد روش خاص سے وابستگی پیدا ہوئی۔ دوسرے قیام دہلی کے اثرات کے تحت جب ان کی طبیعت نے پختگی پائی اور بیدل کے رنگ کو خیر باد کہا۔ تیسرا موڑ واقعۂ اسیری کے زیر اثر آیا۔ جب ان کی جاگیرداری، عزت و ناموس اور خاندانی وقار کا شیش محل چکنا چور ہوا اور "شعر و ادب جو ان کی مادی زندگی میں ضمنی حیثیت رکھتے تھے نان خورد نی کا ذریعہ ہو گئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے خیالات میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہوا"

> قید کے رنج و غم کا ماحصل آنسوؤں کی قطار نہ تھی اس کے عملی نتائج بھی بہت تھے۔ ایک تو یہ کہ مرزا کی جاگیرداری کا وہ طلسماتی ربلکہ کاغذی، محل جسے وہ اپنے رکھ رکھاؤ، سلیقے کار دانی سے برقرار رکھ رہے تھے دھم سے زمین پر آ گرا۔ انھوں نے ابھی تک جاگیرداری اور نوابی کی وضع داری قائم رکھی تھی شاید یہ امید تھی کہ انگریزی اور ہندوستانی دوستوں کی مدد سے کسی ریاست میں کوئی معزز جگہ مل جائے۔ لیکن قید کی ذلت و رسوائی نے یہ سارا طلسم درہم برہم کر دیا۔" [۲۹]

غالبؔ کو ان باتوں کا شدید احساس تھا اور اپنی ذلت و رسوائی کا تصور کر کے رنجیدہ و ملول رہتے تھے۔ مرزا ہر گوپال تفتہ کے نام ایک خط مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۸۵۲ء میں وہ رقم طراز ہیں۔

> "سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا۔ رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا، پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بڑا دھبّہ لگ گیا ہے کسی ریاست میں دخل نہیں کر سکتا مگر ہاں استاد یا پیر یا مداح بن کر راہ و رسم پیدا کروں۔" [۳۰]

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شرمندگی وندامت کے بوجھ تلے دبے جا رہے تھے، ظاہر ہے کہ ایک شریف اور خود دار انسان کے لیے یہ بڑی ذلت کی بات ہے کہ وہ ایک مخرب اخلاق اور سماجی قدروں کی بیخ کنی کرنے والے جرم کا ارتکاب کرے اور دنیا پر اس کا غیر پسندیدہ فعل ظاہر ہو جائے۔ غالب ـــــ عالی خاندان کے فرد صرف شہری ہی نہیں، بنیادی طور پر ایک فن کار تھے۔ ان کی شاعری کی ملک بھر میں شہرت تھی۔ اس لیے بدنامی کا یہ گھاؤ، گہرا گھاؤ تھا۔ جس نے عرصہ تک انھیں بے چین و مضطرب رکھا۔ اس حادثہ نے ان کے رئیسانہ خواب اور خاندان لوہارو کی قرابت کا رکھ رکھاؤ قائم رکھنے کے خواب چکنا چور کر دیے اور انھیں اپنی خودداری چھوڑ کر ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ شیخ محمد اکرام کا کہنا ہے کہ۔

"اس حادثہ کے داخلی نتائج اس سے بھی زیادہ اہم تھے اب تک مرزا کی روحانی زندگی ایک مسلسل کشمکش کی تھی۔ اس "آویزش بخت وزم و طبع جواں" میں مرزا کو کامرانی تو جیتے جی نصیب نہ ہوئی مگر انھوں نے ہمت نہ ہاری۔ غالب کی شاعری اور زندگی کا ایک نہایت دلچسپ اور جرأت آفریں پہلو ان کی مسلسل نبرد آزمائی گر گر کے اٹھنا اور ٹھوکریں کھا کھا کے سنبھلنا ہے لیکن واقعہ قید نے مرزا کی کمر توڑ دی۔ سعی و کوشش تو اب بھی انھوں نے ترک نہ کی لیکن اب انھیں یہ احساس ہو گیا کہ یہ سب باتیں انسان کے بس کی نہیں اور انسانی زندگی میں ایسے مرحلے آجاتے ہیں جب قضا و قدر کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑتے ہیں:

من نہ آنم کہ ازیں سلسلہ ننگم نہ بود
چہ کنم، چوں بہ قضا زہرہ جنگم نہ بود

اور:

نہ تواں کرد با فلک پرخاش
خرد خردہ داں نمی خواہم

یہ وہی "خرد خردہ داں" تھی جس پر وہ ایک زمانے میں ناز کیا کرتے تھے اور چند سال پیشتر کہا تھا کہ دہر با تمیز:

آں را بخت دسترس بذل مال نبوت
طبع سخن رس و خرد خردہ واں دہد

اب ان کے کلام میں رضا و تسلیم کے مضامین زیادہ آنے شروع ہوئے خیالات میں توازن و قرار آگیا اور اضطرار و بے قراری کی جگہ عارفانہ روا قیت نے لے لی ان داخلی تبدیلیوں کا ایک عملی نتیجہ یہ تھا کہ اب مرزا جاگیرداری کے دعاوی سے کنارہ کش ہو گئے تو دوسرا یہ تھا کہ اپنے ادبی نصب العین یعنی اردو کے فارسی میں اظہار خیال میں بھی شکست تسلیم کر لی اور دربار سے وابستہ ہو کر اردو شعر گوئی اور پھر نثر نگاری شروع کی لیکن ان داخلی تبدیلیوں کا ان کے درباری دور کے اردو کلام اور غدر کے بعد اردو خطوط میں دیکھنا چاہیے۔"[۳۱]

مولانا الطاف حسین حالی کے بیان کے مطابق مرزا غالب کے تاثرات قید سے رہائی کے بعد یہ تھے۔

"اگرچہ میں اس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا۔ جو کچھ گزرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے اس پر راضی ہوں۔ مگر آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں۔ میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے یہ بھی جانے دو، خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانۂ رحمۃ للعالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھئے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جاں فرسا ہے، نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزل مقصود قرار دوں سر بہ صحرا نکل جاؤں۔ یہ ہے جو کچھ مجھ پر گزرا اور یہ ہے جس کا میں آرزومند ہوں۔"[۳۲]

لیکن اس کا حقیقی اظہار ان کے حبسیہ ترکیب بند میں ملتا ہے جس میں غالب نے اپنا مرثیہ لکھا ہے۔ اس غالب کا جسے وہ دہلی کے جیل خانے میں دفن کر آئے۔

منم آں کہ خستہ گر زخم جگر بنمایم
برمن از مہر دل گبر و مسلماں سوزد

منم آں سوختہ خرمن کہ از افسانۂ من
نفس راہ رو رہزن و دہقاں سوزد

از نیم دیدۂ من فتنۂ طوفاں خیزد
از تف نالۂ من جوہر کیواں سوزد

آہ ازیں خانہ کہ روشن نہ شود در شبِ تار
جز بداں خواب کہ در چشم نگہباں سوزد

اے کہ دراز و بہ شب ہا بہ چراغم شمری
دلم از سینہ بروں آر کہ داغم شمری

حبسیۂ غالبؔ کی اہمیت

غالبؔ نے اسیری کے دوران فارسی زبان میں ایک ترکیب بند لکھا جو فارسی نظم کی تاریخ میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر غالب قید نہ ہوتے تو ادبی دنیا اس بے مثل نظم سے محروم رہ جاتی، جس کا ہر شعر کیف و اثر کی منہ بولتی تصویر ہے اور ایک دردمند دل پر بیتتے ہوئے حادثات کا آئینہ۔ یہ ترکیب بند صرف غالبؔ کی ذات ہی کا مرثیہ نہیں، جاگیردارانہ نظام کے معاشرے کا مرثیہ ہے۔ جس میں غالب کے سوزِ دروں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رہنی چاہیے کہ یہ نظم مرثیہ نہیں، حبسیہ ہے اور قید خانے کی چہار دیواری میں لکھا گیا ہے۔ قید خانے کا تصور خود اپنی جگہ بے انتہا تکلیف دہ اور اذیت ناک تصور ہے اور قید خانے کی زندگی، چاہے وہ کتنی ہی آرام دہ زندگی ہو، جہنم کی زندگی سے مشابہ قرار دی گئی ہے۔ صاحب احساس انسان کے لیے وہ زندگی واقعی جہنم بن جایا کرتی ہے، وہاں جو دل دوز صدائیں بلند ہوتی ہیں، وہ قلب و جگر کو پھونکنے کے لیے کافی ہیں۔ غالبؔ بلاشبہ ایک صاحب احساس انسان تھے، ان کے اسی احساس کی پکار نے ترکیب بند کی شکل اختیار کرلی،

یہ ترکیب بند ۸۴ اشعار پر مشتمل ہے اور فارسی ادب کا لافانی شاہکار ہے۔ اس ترکیب بند کے متعلق مالک رام نے لکھا ہے :

"قید خانے میں جو ترکیب بند انھوں نے (مرزا غالب) لکھا ہے جسے ہم موضوع کی مناسبت سے اسیریہ کہہ سکتے ہیں، وہ فارسی نظم کے سرمایہ میں بیش بہا اضافہ ہے۔ اسلوب بیان اور سوز وگداز، شدت جذبات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ خاقانی کے حبسیہ سے کسی طرح کم نہیں بلکہ بعض مقامات پر یقیناً اس سے بڑھ گیا ہے۔" ۳۳

غالب کے عزیزوں اور دوستوں نے اس ترکیب بند کو کلیات نظم میں شامل نہیں ہونے دیا تھا، شاید اس خیال کے پیش نظر کہ اس کی اشاعت سے غالب کی رسوائی ہوگی اور ان کی قید ہمیشہ کے لیے منظر عام پر آجائے گی۔ کلیات نظم کی اشاعت کے بعد غالب نے اسے "سبد چین" میں شامل کر لیا تھا جو ان کے متفرق کلام کا مجموعہ ہے۔ "سبد چین" کا کلام بعد کے ایڈیشنوں میں شامل نہیں کیا گیا۔

اس حبسیہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ تنہائی اور اسیری کی اذیت سے زیادہ غالب کو رسوائی و ذلت کی جراحتوں کا احساس تھا۔ اس سانحہ نے انھیں بے پناہ متاثر کیا تھا۔ دکھ درد، تنہائی اور ذلت کے احساس سے ان کا دل خون ہوگیا تھا تاہم اس حبسیہ میں بے ساختگی کے باوجود جو تخیلی بلند پروازی اور فنی پختگی ہے وہ اس بات کا پختہ ثبوت ہے کہ وہ اعصابی تشنج پر قابو پانے کی قدرت رکھتے تھے۔ اس نظم میں بھی درد وغم کی ایک تہ نشیں موج کے باوجود ان کی وسیع المشربی، شوخیٔ فکر اور شگفتگیٔ بیان کے نقوش جا بجا ملتے ہیں۔

حواشی :-

لہ ارمغان آصف : مرتبہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی ۔ صفحہ ح۔ط

۲ہ " " " "

۳؎ دہلی اردو اخبار : ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء صفحہ ۴۔ک ۲ (نیشنل آرکائیز دہلی)

۴؎ فوائد الناظرین : ۳۱ مئی ۱۸۴۷ء

۵؎ لال قلعہ کی ایک جھلک : ناصر نذیر فراق، صفحہ ۳۳

۶؎ غالب : غلام رسول مہر (طبع چہارم) صفحہ ۱۸۴

۷؎ ذکر غالب : مالک رام (جدید ایڈیشن) صفحہ ۱۰۸

۸؎ یادگار غالب : الطاف حسین حالی،

۹؎ باغ دودر : صفحہ ۲، الف (بحوالہ دیوان غالب نسخۂ عرشی : صفحہ ۵۹)

۱۰؎ ذکر غالب مالک رام (جدید ایڈیشن) صفحہ ۱۰۵

۱۱؎ نیا دور، غالب نمبر: ۱۹۶۹ء صفحہ ۱۳۷

۱۲؎ دہلی اردو اخبار : ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء صفحہ ۴ ک ۲، شمارہ ۲۳۴ (نیشنل آرکائیز دہلی)

۱۳؎ ہندوستانی اخبار نویسی : محمد عتیق صدیقی، صفحہ ۲۵۵

۱۴؎ احسن الاخبار (بمبئی) : جلد ۴ نمبر ۱۶، ۲۵ جون ۱۸۴۷ء (بحوالہ دہلی کا آخری سانس : خواجہ حسن نظامی مطبوعہ دہلی صفحہ ۱۷۱)

۱۵؎ دہلی کا آخری سانس : خواجہ حسن نظامی، صفحہ ۱۷۴۔۱۷۵

۱۶؎ تذکرہ شعرائے اردو: مطبو العلوم دہلی، صفحہ ۳۷۸

۱۷؎ آب حیات : محمد حسین آزاد، مطبوعہ لاہور

۱۸؎ چراغ دہلی : مرزا حیرت دہلوی، مطبوعہ دہلی، صفحہ ۳۲

۱۹؎ کلام عاصی : منشی گھن شیام داس عاصی دہلوی، صفحہ ۲۶۳۔۲۶۴

۲۰؎ شاہ نصیرؔ نے شاہ اسماعیلؒ کی شہادت پر ایک نظم کہی تھی جس پر ہنگامہ ہوا اور شاہ نصیر خطرے میں پڑ گئے۔ میرزا خانی کوتوال نے بچایا۔

۲۱؎ غالب : غلام رسول مہر، صفحہ ۱۹۴

۲۲؎ غالب نامہ : (جزا اول) شیخ اکرام (چوتھا ایڈیشن) صفحہ ۱۰۶

۲۳؎ آثار الصنادید: سرسید احمد، مطبوعہ ۱۹۶۵ء صفحہ ۲۶۰۔۲۶۱

۲۴ھ یادگارِ غالب : الطاف حسین حالی، مطبوعہ لاہور

۲۵ھ غالب : غلام رسول مہر، صفحہ ۱۸۷-۱۸۸

۲۶ھ " " : " " " ۱۸۸-۱۸۹

۲۷ھ دیوان غالب مع شرح : نظامی بدایونی، طبع ششم، صفحہ ۲۱۸

۲۸ھ غالب : غلام رسول مہر، صفحہ ۱۸۴

۲۹ھ حیات غالب: شیخ محمد اکرام، صفحہ ۱۲۵-۱۲۶

۳۰ھ

۳۱ھ حیات غالب : شیخ محمد اکرام، صفحہ ۱۲۷-۱۲۸

۳۲ھ یادگار غالب : الطاف حسین حالی، صفحہ ۲۷-۲۸ (دیکھیے خط بنام تفضل حسین خاں، باغ دو در صفحہ ۱۴۳) دیکھیے دیوان غالب، نسخہ عرشی، صفحہ ۶۰

۳۳ھ ذکر غالب : مالک رام (جدید ایڈیشن) صفحہ ۱۰۹۔

حبسیۂ غالب

فارسی ترکیب بند

خواہم از بند بہ زنداں سخن آغاز کنم
غم دل پردہ دری کرد فغاں ساز کنم

بہ نوائے کہ زمضراب چکاند خوناب
خویشتن را بہ سخن زمزمہ پرواز کنم

درخرابی بہ جہاں مے کدہ بنیاد نہم
در اسیری بہ سخن دعویٰ اعجاز کنم

بے مشقت نبود قید، بہ شعر آویزم
روز کے چند رسن تابی آواز کنم

چوں سرایم سخن انصاف زجرم خواہم
چوں نویسم غزل اندیشہ زغماز کنم

تا چہ افسوں بہ خود از ہیبت صیاد دہم
تا چہ خوں در جگر از حسرتِ پرواز کنم

یار دیرینہ قدم رنجہ مفرما کایں جا
آں نہ گنبد کہ تو در کوبی و من باز کنم

ہائے ناسازیٔ طالع کہ بہ من گردد باز
با خرد شکوہ گر از طالع ناساز کنم
اہل زنداں بہ سر و چشم خودم جا دادند
تا بدیں صدر نشینی چہ قدر ناز کنم
ہلہ دزدان گرفتارِ وفا نیست بہ شہر
خویشتن را بہ شما ہمدم و ہمراز کنم
من گرفتار و ایں دائرہ دوزخ تن زن
در سخن پیرویٔ شیوۂ ایجاز کنم
گرچہ تو قیع گرفتاری جاویدم نیست
لیکن از دہر وگر خوش دلی امیدم نیست
شمع ہرچند بہ ہر زاویہ آساں سوزد
خوشتر آں است کہ بر نطع درایوں سوزد
عودِ من ہرزہ سوزید، وگر سوختنی است
بگزارید کہ در مجمر سلطاں سوزد
خانہ ام ز آتش بیدادِ عدو سوخت دریغ
سوختن داشت ز شمعے کہ شبستاں سوزد
منم آں خستہ کہ گر زخم جگر بنمائیم
بر من از مہر دل گبر و مسلماں سوزد
منم آں سوختہ خرمن کہ فسانہ من با
نفس راہرو و رہزن و دہقاں سوزد
منم آں قیس کہ سوئے من آید لیلے
محمل ز شعلہ، آواز حدی خواں سوزد

تا چراغم گذرد در بہ شب ہا در باب
از چراغے کہ عکس بردر زنداں سوزد
تنم از بند در انبوہِ رقیباں لرزد
دلم از درد بر اندوہ اسیراں سوزد
از نم دیدۂ من فتنۂ طوفاں خیزد
از تف نالۂ من جوہر کیواں سوزد
آہ زیں خانہ کہ روشن نہ شود در شب تار
جز بداں خواب کہ در چشم نگہباں سوزد
آہ زیں خانہ کہ در وے نتواں باخت ہوا
جز سمومے کہ خس و خار بیاباں سوزد
اے کہ درزاد بہ شب ہا بہ چراغم شمری
دلم از سینہ بروں آر کہ داغم شمری
پاسباناں بہم آئید کہ من می آیم !
در زنداں بکشائید کہ من می آیم
ہر کہ دیدے بہ در خویش سپاسم گفتے
خبر مقدم بہ سرائید کہ من می آیم
جادہ نشناسم زانبوہ شما می ترسم
راہم از دور نمائید کہ من می آیم
رہرو جادۂ تسلیم درشتی نہ کند
سخت گیرند چرا ئید کہ من می آیم
خستہ تن در رہ و تعذیب ضرور است اینجا
نمک آرید و برسائید کہ من می آیم

عارض خاک بہ پاشیدن خوں تازہ کنید
رونق خانہ فزائید کہ من می آیم

چوں من آیم بہ شما شکوہ گردوں نہ رواست
زیں سپس ژاژ مخائید کہ من می آیم

ہاں عزیزاں کہ دریں کلبہ اقامت دارید
بخت خود را بستائید کہ من می آیم

تا بہ دروازہ زنداں پئے آوردن من
قدمے رنجہ نمائید کہ من می آیم

چوں سخن سنجی و فرزانگی آئین من است
بہرہ از من بربائید کہ من می آیم

بخود از شوق بہ بالید کہ خود باز روید
بہ من از بہر گرائید کہ من می آیم

بسکہ خویشاں شدہ بیگانہ ز بد نامی من!
نشگفت خورد گر غم ناکامی من

آنچہ فرداست ہم امروز در آمد گوئی
آفتاب از جہت قبلہ بر آمد گوئی

دل و دستے کہ مرا بود فرو ماندہ ز کار
شب و روزے کہ مرا بود سر آمد گوئی

سرگزشتم ہمہ رنج و الم آرگفتی!
سرنوشتم ہمہ خوف و خطر آمد گوئی

بہرہ اہل جہاں چوں ز جہاں درد و غم است
بہرہ من ز جہاں بیشتر آمد گوئی

خستن و بستن من در عس نیست برد
برمن اینها زقضا و قدر آمد گوئ
ہنرم را نتواں کرد بہ خستن ضائع
خستگی غازہ روئے ہنر آمد گوئ
غم دل داشتم اینک غم جانم دادند
زخم را زخم دگر برا ثر آمد گوئ
چرخ یک مرد گراں مایہ بہ زنداں خواہد
یوسف از قید زلیخا بدر آمد گوئ
مژہ شب از کجا ایں ہمہ خونناب آورد
ایں چنیں گرم ز زخم جگر آمد گوئ
خود چرا خوں خورم از غم کہ بہ غم خواری من
رحمت حق بہ لباس بشر آمد گوئ
خواجۂ ہست دریں شہر کہ از پرسش وے
پایہ خویشتنم در نظر آمد گوئ
مصطفےٰ خاںؒ کہ دریں واقعہ غم خوار من است
گر بہ میرم چہ غم از مرگ عزادار من است
خواجہ دانم کہ بسے روز نہ مانم در بند
لیک دانی کہ شب و روز ندانم در بند
نہ پسندم کہ کس آید نتوانم کہ روم
جانب دریچہ حسرت نگرانم در بند
خستہ ام خستہ من و دعوئ تمکین حاشا
بند سخت است تپیدن نتوانم در بند

شادم از بند کہ از بند معاش آزادم
از کف شحنہ رسد و جامہ نانم در بند
آمہ و خامہ بیارید و سجل بنوید
خواب از بخت ہمی دام ستانم در بند
یارب ایں گو ہر معنی کہ نشانم زکجاست
بند در تن بود و نیست زبانم در بند
ہرکس از بند گراں نالد وناکس کہ منم
نالم از خویش کہ بر خویش گرانم در بند
خوئے خوش بہر مصیبت زدہ رنج دگراست
رنجہ از دیدن رنج دگرانم در بند
رفتہ دربارۂ من حکم کہ باور دو دریغ
شش مہ از عمر گرامی گزرانم در بند
اگر ایں است خود آں است کہ عید اضحیٰ
گزرد نیز چوں عید رمضانم در بند
مدت قید اگر در نظرم ہست چرا
خونِ دل از مژہ بے صرفہ چکانم در بند
نیستم طفل کہ در بند رہائیِ باشم!
ہم ز ذوق است کہ در سلسلہ ہائے باشم!
من نہ آنم کہ ازیں سلسلہ ننگم نبود
چہ کنم چوں بہ قضا زہرہ جنگم نہ بود
زیں دو رنگ آمدہ صد رنگ خرابی بہ ظہور
گلہ نیست کہ از بخت دو رنگم نبود

راز دانا غم رسوائی جاوید بلاست
بہر آزار غم از قید فرنگم نبود
لرزم از خوف دریں حجرہ کہ از خشت و گل است
ورنہ در دل خطرہ از کام نہنگم نبود
زیں دو سرہنگ کہ پویند بہم می ترسم
بیمے از شیر و ہراسے ز پلنگم نبود
منم آئینہ و ایں حادثہ زنگ است وے
تاب بدنامی آلائش زنگم نبود
آہ ازاں دم کہ سراپند ز زنداں آمد
اندریں دائرہ گیرم کہ درنگم نبود
ہمدماں دارم امید رہائی در بند
دامن از بعد رہائی تہ سنگم نبود!
جور اعدا رود از دل بہ رہائی لیکن
طعن احباب کم از زخم خدنگم نبود
بہ شگاف قلم از سینہ بروں سیر پرند
بسکہ گنجائی غم در دل تنگم نبود
حاش للہ کہ دریں سلسلہ باشم خوشنود
چہ کنم سرایں رشتہ بچنگم نبود
بصریر قلم خویش بود مستی من
اندریں بند گراں بیں و سبک دستی من
ہمدماں در دلم از دیدہ نہانید ہمہ
غالب غم زدہ را روح و روانید ہمہ

الحمد الله کہ در عیش نشاطید ہمہ
للّٰہ الشکر کہ باشوکت و شانید ہمہ
ہم در آئین نظر سحر طرازید ہمہ
ہم در اقلیم سخن شاہ نشانید ہمہ
چشم بد دور کہ فرخندہ لقائید ہمہ
شاد باشید کہ فرخ گہرانید ہمہ
سود بیناو و فادیدہ و نو رید ہمہ
زندہ مانید صفا قالب وجانید ہمہ
من بخوں خفتہ و بینم ہمہ بے بیند ہمہ
من جگر خستہ و دانم ہمہ دانید ہمہ
درمیاں ضابطہ مہر و وفائے بوداست
من بر ہیچم کہ ہر آئینہ بر آیند ہمہ
روزے از مہر نگفتید فلانے چون است
بارے از لطف بگوئید چسانید ہمہ
گر نباشم بہ جہاں خاروخسے کم گیرید
دل اگر خداوند زبانید ہمہ
چارہ گر نتواں کرد دعائے کافی است
دل اگر نیست خدا دید زبانید ہمہ
ہفت بنداست کہ در بند رقم ساختہ ام
بنویسید و بہ بگیرید بخوانید ہمہ
آں نہ باشم کہ بہ ہر بزم ز من یاد آرید
دارم امید کہ در بزم سخن یاد آرید

ترجمہ ترکیب بند

چونکہ میرے دل کے غموں نے میرے سارے راز فاش کر دیے ہیں اس لیے میں چاہتا ہوں کہ قید خانے سے اپنی گفتگو کا آغاز کروں۔

میں ایسی آواز سے زمزمہ پرداز کرنا چاہتا ہوں کہ مضراب سے خون کے آنسو ٹپکنے لگیں۔

میں اپنی پریشانیوں کے عالم میں بھی مے کدے کی بنیاد ڈالتا ہوں اور اپنی اسیری میں بھی اپنی شاعری میں خلاف توقع باتیں کہہ جاتا ہوں

میں اپنے منہ میں کب تک لگام ڈالے رہوں، یعنی میں کب تک خاموش رہوں. اسیری بے مشقت نہ گزرے اس لیے چند روز کی رسّی بٹنا چاہتا ہوں (یعنی شعر گوئی کرنا چاہتا ہوں)

جب تک میں اپنے اشعار سناتا ہوں، مجرموں سے انصاف کا طالب رہتا ہوں اور جب میں کوئی غزل سناتا ہوں تو خود کو مجرم تصور کرنے لگتا ہوں۔

میں صیاد کے پھندے میں کب تک پڑا رہوں اور میرا دل اس کی فسوں کاریوں کے خوف سے کب تک گھبراتا رہے اور میں کب تک حسرت پرواز لیے اپنا خون جگر پیتا رہوں۔

اے میرے ہمدم دیرینہ! تم یہاں آنے کی زحمت نہ کرنا کیوں کہ یہ ممکن نہیں ہے تم دروازے پر دستک دو اور میں دروازہ کھول دوں۔ یہ بات میرے اختیار میں نہیں ہے۔

ہائے یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ اگر ہم اپنی عقل سے ناسازیٔ طالع کا شکوہ کریں اور

ہمیں دوبارہ اسیر کر دیا جاتے۔

مجھے اہل زنداں نے خوشی خوشی یہاں جگہ عنایت کی اور اپنی محفل کا صدر بنایا۔ میں اپنی اس عزت افزائی پر جتنا ناز کروں کم ہے۔

اے گرفتار چوروں کی جماعت! ہوشیار ہو جاؤ کیوں کہ شہر میں وفا کی امید بالکل نہیں ہے۔ اسی لیے میں خود کو تمہارا دوست اور ہمراز بنانا چاہتا ہوں۔

میں گرفتار ہوں اور دوزخ کی چہار دیواری دوزخ کی مانند ہے۔ پھر بھی میں اپنی شاعری میں صنعت ایجاز سے کام لیتا ہوں۔

اگر میری اسیری دائمی نہیں ہے ایک نہ ایک دن یہاں سے رہائی ضرور ملے گی مگر دنیا سے کسی اچھی اور دل خوش کن بات کی امید قطعی نہیں ہے۔

شمع ہر طرح اور ہر زاویہ سے ہر حال میں جلتی رہتی ہے مگر اچھی (خوش نصیب) شمع وہی ہے جو بادشاہ کے دروازے پر جلے۔

میری عود کی لکڑی کو فضول مت جلاؤ، اگر اسے جلانا ہی ہے تو بادشاہ کی انگیٹھی میں ڈال کر جلاؤ۔ کیوں کہ یہ تو اسی میں جلنے کے قابل ہے۔

میرے گھر کو دشمنوں نے بے دریغ پھونک ڈالا مجھے افسوس ہے کیونکہ اس کو تو اس چراغ سے جلانا چاہیے تھا جو بادشاہوں کی آرام گاہ میں جلتا ہے۔

میں وہ خستہ حال ہوں کہ اگر میں اپنے جگر کے زخم دکھاوں تو میری کیفیت دیکھ کر ہندو اور مسلمان دونوں کے دلوں میں ہمدردی کے شعلے بھڑک اٹھیں۔

میں وہ سوختہ ساماں ہوں کہ میرے افسانے کو سن کر مسافر، رہزن اور دہقان سبھی کا دل جل اٹھتا ہے۔

میں وہ بدقسمت قیس (عاشق) ہوں کہ میری جانب لیلیٰ (معشوق) آئے تو اس کا محمل حدی خوانوں کی شعلہ بیانیوں سے جل جائے۔

جب کہ میری رات اس شمع کے سہارے گزرتی ہے جس کو چوکیدار نے قید خانے کے دروازے پر جلا رکھا ہے تو پھر میرا دن کیسے گزرے گا۔ یعنی رات میں چراغ تک میسر نہیں ہے

جس سے اجالا ہو سکے۔

میرا جسم قید خانے میں رقیبوں کی اکثریت (کثرت) سے لرزتا ہے اور میرا دل اسیران زنداں کے دکھ درد کو دیکھ کر جلنے لگتا ہے۔

میری اشک آلود آنکھوں سے طوفان برپا رہتا ہے اور میرے پُر افسوس نالوں سے جو ہر کیواں جلنے لگتا ہے۔

افسوس صد افسوس اس گھر (قید خانہ) میں تیرہ و تاریک راتوں میں بھی روشنی نہیں ہوتی ہے۔ بجز اس نیند کی روشنی کے جو نگہبان کی آنکھوں میں ہوتی ہے یعنی پہرے داری ساری رات جاگتے رہتے ہیں۔

افسوس صد افسوس کہ اس گھر (قید خانہ) میں کسی قسم کی ہوا تک نہیں آتی ہے بجز باد سموم کے جو خس و خاشاک کو جلا دیتی ہے۔

ہمارے دل کے داغوں سے جو چراغ روشن ہیں اگر تم رات کو ان کا شمار کرنا چاہتے ہو تو میرے دل کو، میرے سینے سے باہر نکال کر دیکھو۔ تمھیں دل کے داغوں کا شمار ہو جائے گا۔

اے پاسبانو! تم سب ساتھ مل کر میرے استقبال کے لیے آؤ اور زنداں کے دروازے کو کھول دو کیونکہ میں آ رہا ہوں۔

جس نے بھی مجھے اپنے دروازے پر آتے دیکھا اس نے میرا استقبال کیا اور میری خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا۔ چنانچہ میں قید خانے کے دروازے پر آ رہا ہوں۔ تم لوگ میرا استقبال کرو اور میری خدمت میں سپاس نامہ پیش کرو۔

میں راستہ نہیں پہچانتا ہوں اور تم لوگوں کے ہجوم سے خوف زدہ ہوں۔ تم لوگ مجھے دور ہی سے راستہ دکھاؤ اور میرے قریب نہ آؤ میں خود ہی آتا ہوں۔

جادۂ تسلیم کا مسافر کبھی سختی و درشتی کا سلوک نہیں کرتا ہے تو پھر تم سختی سے کیوں پیش آتے ہو۔ میں تو خود قید خانہ کی طرف چل رہا ہوں۔

اس زنداں کے راستہ میں جسم پر عذاب ضرور نازل ہوگا، یعنی جسم زخمی ضرور ہوگا۔ اس لیے نمک لاؤ اور ان زخموں پر چھڑکو، کیونکہ میں آ رہا ہوں۔

ہمارے خون سے زمین کے عارض یعنی سطح زمین کو سینچ ڈالو اور اسے تازہ کرو اور اپنے گھر (قید خانہ) کی رونق بڑھاؤ کیوں کہ میں آ رہا ہوں۔

جب میں تمہارے نزدیک خود آ رہا ہوں اس لیے تمہارا آسمان سے شکوہ کرنا بے جا ہے۔ تم اپنی بکو اس مت کرو کہ میں آ رہا ہوں۔

اے قید خانے میں رہنے والے دوستو اپنی قسمت پر ناز کرو کہ میں آ رہا ہوں۔

میرے استقبال کے لیے اور مجھے لینے کے لیے زنداں کے دروازے تک قدم رنجہ فرماؤ کہ میں آ رہا ہوں۔

جب کہ میرا آئین سخن سنجی اور فرزانگی ہے تو تم لوگ میری خاطر نغمہ سرائی کرو کہ میں آ رہا ہوں۔

تم خود سے پھر میری طرف شوق کے ساتھ بڑھو اور مجھے اپنی محبت سے نوازو کہ میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔

میرے اپنے عزیز بھی میری بدنامیوں کی وجہ سے بے گانے ہو گئے ہیں، غیر تو غیر ہیں میری ناکامیوں کا غم انھیں کیوں ہو گا۔ یعنی قید و بند کے ایام میں میری بدنامی کی وجہ سے اپنے لوگ بھی پرائے ہو گئے ہیں۔ غیروں کو مجھ سے ہمدردی کیوں کر ہو سکتی ہے۔

اے دوستو! تم کہو گے کہ گویا ایک ذرہ بھی آج آفتاب بن کر مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہو رہا ہے۔

میرا دل اور میرے ہاتھ پاؤں رات دن کام کرتے کرتے تھک گئے ہیں اور مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میرے شب و روز ختم ہو چکے ہیں یعنی میری زندگی کے دن ختم ہو رہے ہیں۔

اے دوستو! تم کہو گے کہ گویا میری سرگزشت ایسی ہے جس سے دوسروں کے دل کو تکلیف پہنچتی ہے اور میری سرنوشت سے لوگوں کو ڈر اور خوف معلوم ہوتا ہے۔

دنیا والوں کی قسمت میں اس دنیا کی وجہ سے درد و غم ہیں تو پھر میرے درد و غم کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ میری قسمت میں اس دنیا سے زیادہ درد و غم ہیں۔

قید خانے کے چوکیدار جو مجھے مار پیٹ رہے ہیں اور میرے ساتھ بدسلوکی کر رہے

ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ قضا و قدر کی طرف سے میرے لیے ایسا سلوک کرنے پر مامور کیے گئے ہیں۔

میری ہڈی کو ضرب کاری سے ضائع نہ کرو کیوں کہ جب یہ خود بخود خستہ ہو جاتی ہے تو چہرے پر غازہ لگانے کا کام دیتی ہے۔

میرا دل پہلے ہی سے غم زدہ تھا۔ ان لوگوں نے مجھے اپنی جان کا بھی غم دے دیا گویا ایک زخم پر دوسرے زخم کا بھی اثر ہو گیا۔

آسمان ایک عظیم شخص کو گرفتار کرنا چاہتا ہے اس لیے تم کہہ سکتے ہو کہ وہ یوسف زلیخا کی قید سے نجات پا گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ چرخ اسے اسیر کرنا چاہتا ہے۔

میری پلکیں خوں آلود کہاں سے ہوئی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ یہ گرم گرم خون جو میری پلکوں پر ہے وہ میرا خون جگر ہے۔

میں رنج و غم کی شدت سے پریشان ہو کر اپنے کو ہلاکت میں کیوں مبتلا کروں اور خون دل کیوں کر رہا ہوں۔ کیونکہ میری غم خواری کے لیے تو رحمت حق انسان کی شکل میں نازل ہوئی ہے۔

اس شہر میں ایک معزز ہستی ہے جس کی پرستش سے میرا مرتبہ لوگوں کی نظروں میں بلند ہو گیا ہے۔

نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ جو میرے قید و بند کے واقعے سے واقف ہیں اور میرے کرم فرما اور ہمدرد ہیں انھیں میری فکر ہے تو پھر موت سے ہم کو کیا ڈر ہو سکتا ہے۔ اگر میں اس قید خانہ میں بھی جاؤں گا تو میرا ماتم کرنے والا تو موجود ہے۔

میرے کرم فرما ایسے بزرگ ہیں کہ میں زیادہ دن تک قید خانہ میں نہیں رہ سکوں گا لیکن مجھے یہ امید بھی ہے کہ مجھ پر رات کے سوا دن گزرنے کی نوبت نہیں آئے گی یعنی میں رات میں ہی رہا ہو جاؤں گا۔

میں اپنی رہائی کے لیے نہ کسی کے پاس جانا چاہتا ہوں اور نہ یہ پسند کرتا ہوں کہ کوئی میرے پاس آئے بلکہ حسرت سے انھیں بزرگ (شیفتہ) کے دریچہ کی طرف قید خانہ

سے دیکھتا رہتا ہوں۔

میں پریشان حال اور خستہ جگر ہوں، میں اپنی عظمت اور بڑائی کا دعویٰ کیسے کرسکتا ہوں قیدخانہ کی زندگی بے حد پریشان کن اور اذیت ناک ہے۔ میں اس طرح کی باتیں کرکے اس قیدخانہ کو جلانا یا تپانا نہیں چاہتا ہوں۔

میں خوش ہوں کہ قیدخانہ میں معاش کی فکر سے آزاد ہوں۔ روٹی اور کپڑا مجھے قیدخانہ کے داروغہ سے ملتا ہے۔

قلم اور دوات لے آؤ اور یہ عجیب و غریب بات لکھو کہ میں اپنی قسمت کی تعریف اس قیدخانہ میں بھی کرتا ہوں اور یہاں اپنے سوئے ہوئے نصیبہ سے نیند ادھار لینا چاہتا ہوں۔

اے پروردگار! میرے قلم سے جو گوہر معنی نکلتے ہیں یہ کہاں سے آتے ہیں، میرا جسم قیدخانہ میں اسیر ہے مگر میری زبان پر پابندی نہیں ہے (تبھی)، تو میری زبان سے گوہر معنی کی یہ بارش ہو رہی ہے۔

ہر شخص اس قیدخانہ کی سختی سے پریشان ہے اور رو رہا ہے مگر اس قیدخانہ میں کوئی شخص رو نہیں رہا ہے تو وہ میں ہوں۔ کیوں کہ میں تو اس بات پر آنسو بہا رہا ہوں کہ میں خود اپنی ذات پر گراں ہوں۔ قیدخانہ کی سختیوں پر کیا رووُں؟

اس قیدخانہ میں رنج و غم تو غم زدہ لوگوں کے لیے مصیبت کا باعث ہے مگر خوش و خرم رہنا بھی یہاں مصیبت سے کم نہیں ہے یعنی قیدخانہ میں خوش و خرم رہنا بھی بڑی مصیبت کا کام ہے۔

میرے لیے دربار عالی سے چھ ماہ کی قید سخت کا حکم ہوا۔ اس لیے مجھے اس قیدخانہ میں مصیبت و آلام کے ساتھ عمر عزیز کے چھ ماہ گزارنا ہیں۔

اگر میری قید اور مصائب و آلام کا یہی عالم رہا تو رمضان اور عید کی طرح، میری عید اضحیٰ بھی قیدخانے میں گزرے گی۔

اگرچہ میری نظروں میں اس قید کی مدت کی کوئی حقیقت نہیں ہے تو پھر میں خون کے

آنسو کیوں بہاؤں۔ یا اپنے مژگاں کو خون دل سے کیوں تر کرتا رہوں۔

میں کوئی بچہ نہیں ہوں کہ قید و بند کی صعوبت سے گھبرا کر اس سے رہائی کی فکر کروں یہ میرے (بلندئ) ذوق کی بات ہے کہ (ہمیشہ مختلف قسم کی) بیڑیوں میں گرفتار رہتا ہوں۔

میں ان لوگوں سے نہیں ہوں کہ جنھیں اس سزا (قید) سے اپنی بے عزتی محسوس نہیں ہوتی مجھے تو اس قید سے بے حد شرمندگی ہے اور میرے لیے یہ باعث ننگ ہے مگر کیا کروں قضا و قدر سے لڑنے کی مجھ میں قوت کہاں ہے میری یہ بدنامی و رسوائی قدرت کی طرف سے عطا ہوئی ہے۔

میری قسمت کی دورنگی نے میری خرابی کے سیکڑوں رنگ پیدا کر دئے ہیں۔ مجھے اس بات کا اب کوئی شکوہ نہیں رہ گیا ہے کہ میری قسمت کی دورنگی نہیں ہوئی۔

نکتہ شناس اور دور اندیش لوگوں کے لیے ان کی رسوائی ہمیشہ کے لیے مصیبت بن جاتی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو میرے لیے قید فرنگ مصیبت کا باعث نہ بنتی۔ بلکہ میری مصیبت تو یہ ہے کہ یہ رسوائی ہمیشہ کے لیے باعث ننگ رہے گی۔

میں اس قید خانے کے حجرے سے بے حد خائف ہوں کیوں کہ یہ اینٹ اور گارے سے بنا ہوا ہے۔ اس قید خانے کی مصیبت میرے لیے سخت پریشان کن ہے ورنہ مجھے تو کبھی گھڑیال کے منہ میں جانے کے عمل سے بھی خوف محسوس نہیں ہوتا ہے۔

مجھے شیر اور چیتے وغیرہ سے اتنا خوف محسوس نہیں ہوتا جتنا میں ان پہرہ داروں سے ڈرتا ہوں جو قید خانے میں ادھر ادھر گشت کرتے رہتے ہیں۔ یعنی سایہ کی طرح میرے ساتھ رہتے ہیں۔

میں ایک آئینہ کی مانند ہوں اور میری اسیری اس آئینہ کے لیے زنگ، مجھ میں اس بدنامی کے برداشت کرنے کی قوت نہیں ہے۔

وہ لمحہ بڑا ہی افسوس ناک تھا جب قید خانے سے میری گرفتاری کا پروانہ اس طرح بتا ہوا آیا کہ اس نے دم لینے کی بھی مہلت نہ دی۔

اے دوستو! قید خانہ سے میری رہائی کی امید رکھو۔ یہاں سے رہائی کے بعد میرا دامن

پتھر کے نیچے نہیں ہوا۔

دشمنوں کے ظلم وستم تو میں برداشت کر لیتا ہوں، اس کا میرے دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا لیکن دوستوں کے طعنے ہمارے زخموں کے لیے تیر کا کام کر دیتے ہیں۔

میرے دل کے زخموں کے درد قلم کے شگاف سے ٹپک رہے ہیں۔ پھر بھی دل کے درد میں کوئی کمی نہیں ہوتی ہے۔

خدا ہم کو اس سے بچائے، میں اس اسیری سے اس لیے خوش ہوں کہ اس رشتۂ اسیری کا سرا اپنی مٹھی میں نہیں ہے یعنی میری رہائی میرے بس سے باہر کی بات ہے۔

اس قید خانہ کی سختیوں کے باوجود ہماری سبک روشی ملاحظہ فرمائیے کہ ہمارے قلم کی آواز ہی دراصل ہماری مستی ہوتی ہے جس سے ہم خوش رہتے ہیں۔

اے دوستو! اپنی آنکھوں سے میرے دل کو دیکھو اور غالبؔ غم زدہ کے لیے تم لوگ روح رواں کی حیثیت رکھتے ہو لہٰذا اس کی دل جوئی کرو۔

اللہ کا شکر ہے کہ تم لوگ عیش وعشرت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہو اور خدا کا شکر ہے کہ تم لوگ شان وشوکت والے ہو۔

تم لوگ آئین نظر کے لیے سبھی سحر طراز کی حیثیت رکھتے ہو اور اقلیم سخن کے بادشاہ ہو۔

تم لوگ نفع بخش، وفا شعار اور روشن ضمیر ہو اس لیے زندہ رہو کہ تم لوگ طہارت قلب اور پاکیزگی جان کے مالک ہو۔

میں خوں آلود سو رہا ہوں مگر تم سب لوگوں کو دیکھ رہا ہوں۔ تم لوگ بھی مجھ کو دیکھو کہ کس حال میں ہوں، میں جگر سوختہ ہو کر تم لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں تم بھی مجھ کو پہچانو۔

ہمارے اور تمہارے درمیان مہر و وفا کا ضابطہ مرتب ہوا ہے میں تو اس کی برابر پابندی کر رہا ہوں مگر اے دوستو تم لوگ بھی اس کی پابندی کرو۔

اے میرے دوستو! تم نے کبھی بھول کر بھی یہ نہیں کہا کہ فلاں شخص (غالبؔ) کس حال میں ہے مگر میں تمہارے خیریت پوچھ رہا ہوں برائے مہربانی ایک بار بتا دو کہ تم لوگ کس حال میں ہو۔

جس دن میں اس دنیا میں نہیں رہوں گا تم لوگ یہ سمجھنا کہ اس دنیا سے ایک گھاس پوس کا ڈھیر کم ہو گیا۔ کیوں کہ تم لوگ تو اس باغ خوباں میں سروسمن کی حیثیت رکھتے ہو اور میں خاروخس ہوں۔

اے دوستو! اگر تم ہماری رہائی کے لیے چارہ جوئی نہیں کر سکتے ہو تو کم از کم میرے لیے دعا ہی کرو۔ یہی ہمارے لیے بہت کافی ہے تم سب لوگ صاحب زبان ہو، اللہ نے تم کو زبان عطا کی ہے، میرے حق میں دعائیں کرو۔

یہ سات بند، جو میں نے قید خانے میں لکھے ہیں انھیں تم لوگ دیکھو پڑھو اور لکھو۔

یہ بند اس لیے میں نے لکھ دیے ہیں کہ جب میں نہ ہوں گا تو تم لوگ مجھے ہر بزم میں یاد کرو گے اور مجھے امید ہے کہ بزم سخن میں مجھے ضرور یاد رکھو گے۔

پھر کھلا ہے درِ خزینۂ راز

غالب پر لکھی گئی تصانیف

یادگارِ غالب	مولانا حالی	۱۸۹۷ء
حیاتِ غالب	مرزا موج	۱۸۹۹ء
حیاتِ غالب	علیم الدین مالک	۱۹۱۰ء
نکاتِ غالب	نظامی بدایونی	۱۹۲۲ء
غالب کا روزنامچہ	خواجہ حسن نظامی	۱۹۲۴ء
غالب اور اس کی شاعری	احمد الدین احمد	۱۹۲۸ء
غالب	سید عبداللطیف	۱۹۳۲ء
یوسف ہندی قیدِ فرنگ میں	محسن بن شبیر	۱۹۳۲ء
روحِ کلامِ غالب	مرزا عزیز بیگ	۱۹۳۵ء
غالب نامہ	شیخ محمد اکرام	۱۹۳۶ء
غالب	غلام رسول مہر	۱۹۳۶ء
ذکرِ غالب	مالک رام	۱۹۳۸
غالب کے لطیفے	ام ام شاہ	۱۹۳۸
سرگزشتِ غالب	مرزا محمد بشیر	۱۹۴۲
شہرتِ عامہ خلاصہ غالب نامہ	بہار الحق	۱۹۴۴ء
غالب کے لطیفے	انتظام اللہ شہابی	۱۹۴۷ء
فرہنگِ غالب	امتیاز علی عرشی	۱۹۴۷ء

متفرقات غالب	مسعود حسن رضوی	۱۹۴۷ء
غالب سوانح حیات اور کلام		۱۹۴۸ء
نادرات غالب	آفاق حسین آفاق	۱۹۴۹ء
اثر غالب	قاضی عبدالودود	۱۹۴۹ء
سرگزشت غالب	محی الدین زور	۱۹۵۰ء
محاسن کلام غالب	عبدالرحمان بجنوری	۱۹۵۲ء
احوال غالب	مختارالدین احمد	۱۹۵۳ء
افکار غالب	خلیفہ عبدالحکیم	۱۹۵۴ء
نقد غالب	مختارالدین احمد	۱۹۵۶ء
تلامذہ غالب	مالک رام	۱۹۵۷ء
باقیات غالب	وجاہت علی سندیلوی	۱۹۶۰ء
غالب ابتدائی دور میں	خورشید الاسلام	۱۹۶۰ء
مقام غالب	مبارز الدین رفعت	۱۹۶۰ء
غالب کی نادر تحریریں	خلیق انجم	۱۹۶۱ء
غالب نام آورم	نادم سیتاپوری	۱۹۶۱ء
غالب فکر وفن	شوکت سبزواری	۱۹۶۱ء
مرزا غالب رائل پارک میں	حمید احمد	۱۹۶۲ء
یادگار غالب	مرتبہ خلیل الرحمٰن داودی	۱۹۶۳ء
جہان غالب	کوثر چاندپوری	۱۹۶۳ء
غالب کے کلام میں الحاقی عناصر	نادم سیتاپوری	۱۹۶۴ء
غالب سے معذرت کے ساتھ	احمد جمال پاشا	۱۹۶۴ء
آئینہ غالب	محکمہ اطلاعات دہلی	۱۹۶۴ء
مرزا غالب	شمیم حنفی	۱۹۶۴ء

غالب شناسی	ظ۔ انصاری	۱۹۶۵ء
چھیڑ غالب سے چلی جائے	اکبر علی خاں	۱۹۶۵ء
مرزا غالب کی شوخیاں	آسی لکھنوی	۱۹۶۵ء
غالب کچھ جائزے	اوصاف احمد، وقار رومانی	۱۹۶۶ء
احوال و نقد غالب	حیات خاں سیال	۱۹۶۷ء
غالب کی کہانی	شفیع الدین نیرّ	۱۹۶۸ء
کہانی میری زبانی میری	حفیظ عباسی	۱۹۶۸ء
سرود غالب	یوسف بخاری	۱۹۶۸ء
مرزا غالب کے لطیفے	والی آسی	۱۹۶۸ء
غالب اور آہنگ غالب	یوسف حسین خاں	۱۹۶۹ء
قاطع برہان بشمول درفش کاریانی	قاضی عبدالودود	۱۹۶۹ء
مرزا نوشہ	عشرت رحمانی	
مقام غالب	موسٰی کلیم	
حیات غالب	عبدالرحمان چغتائی	
حیات غالب	شیخ محمد اکرام	
غالب سے باتیں	شمس یمن گرامی	
غالب شکن	یگانہ چنگیزی	
فلسفہ کلام غالب	شوکت سبزواری	
تجزیہ کلام غالب	سید رفیع الدین بلخی	
محاورات غالب	نریش کمار شادؔ	
فکر غالب	پرتھوی چندر	
انتخاب غالب	عبدالرزاق	
لطائف غالب	حکیم محمد حسن میرٹھی	

نئے ناشیزہ غالب — اکبر رضا

غالب کی تصانیف

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ

(فارسی تصانیف اولیں ایڈیشن)

میخانہ آرزو	مطبع دارالسلام دہلی	۱۸۴۵ء
پنج آہنگ	مطبع سلطانی دہلی	۱۸۴۹ء
مہر نیم روز	فخر المطابع	۱۸۵۴-۵۵ء
دستنبو	مفید خلائق آگرہ	۱۸۵۸ء
قاطع برہان	نول کشور پریس لکھنؤ	۱۸۶۲ء
کلیات نظم فارسی	" " "	۱۸۶۳ء
مثنوی ابر گہر بار	اکمل المطابع دہلی	۱۸۶۳ء
درفش کاویانی	" " "	۱۸۶۵ء
سبد چیں	مطبع محمدی	۱۸۶۷ء
کلیات نثر	مطبع نول کشور لکھنؤ	۱۸۶۸ء
دعائے صباح		
باغ دو در		

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے

(اردو تصانیف اولیں ایڈیشن)

دیوان اردو	سید المطابع دہلی	۱۸۴۱ء
قادر نامہ	مجلس پریس دہلی	۱۸۶۴ء

نامہ غالب	مطبع محمدی دہلی	۱۸۶۵ء
تیغ تیز	اکمل المطابع دہلی	۱۸۶۷ء
نکات ورقعات غالب	مطبع سراج دہلی	۱۸۶۷ء
عود ہندی	مطبع مجتبائی میرٹھ	۱۸۶۸ء
اردوئے معلیٰ		۱۸۶۹ء

ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغ نہاں اور

دیوان اردو کے مشہور نسخے

نسخۂ حمیدیہ	آگرہ	۱۹۲۱ء
مرقع چغتائی	لاہور	۱۹۲۸ء
برلن ایڈیشن		۱۹۳۲ء
تاج ایڈیشن		۱۹۳۸ء
انتخاب غالب	عرشی	۱۹۴۲ء
دیوان غالب	مالک رام	۱۹۵۶ء
دیوان غالب	مصور نقش چغتائی	۱۹۵۸ء
دیوان غالب نسخۂ عرشی		۱۹۵۸ء
دیوان غالب	سردار جعفری	۱۹۵۸ء

مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

(مشہور شرحیں)

بیان غالب	آغا محمد باقر	۱۹۳۹ء
شرح دیوان غالب	طباطبائی	۱۹۴۰ء
مراۃ الغالب	بیخود دہلوی	۱۹۵۵ء

شرحِ دیوان غالب	فرقت کاکوروی	۱۹۶۴ء
شرحِ دیوان غالب	حسرت موہانی	
ترجمانِ غالب	شہاب الدین مصطفیٰ	
اندازِ غالب	نریش کمار شاد	
مشکلاتِ غالب	نیاز فتحپوری	
نشاطِ غالب	وجاہت علی سندیلوی	
کنز المطالب	ابوالحسن ناطق	
وثوق صراحت	محمد عبدالعلی	
حل کلیاتِ اردو	احمد حسن شوکت	
شرحِ دیوان غالب	قاضی سعیدالدین احمد	
روح المطالب	سید اولاد حسین شاداں	
الہاماتِ غالب	ملک محمد عنایت اللہ	
شرحِ دیوان غالب	نوراللہ محمد نوری	
وجدان تحقیق و شرح غالب	مولوی عبدالوحید	
عنقائے معانی	شیر علی افسوس	

رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

(مجموعہ ہائے مکاتیب)

منتخبات اردو	نول کشور لکھنؤ	۱۸۸۷ء
رقعاتِ غالب	شوق امرتسری	۱۹۱۸ء
ادبی خطوطِ غالب	مرزا عسکری	۱۹۳۳ء
مکاتیب الغالب	احسن مارہروی	۱۹۳۶ء
نادر خطوطِ غالب	محمد اسمٰعیل رسا ہمرانی	۱۹۳۹ء

خطوط غالب	مہیش پرشاد	۱۹۴۱ء
مکاتیب غالب	عرشی	۱۹۴۲
روح غالب	محی الدین قادری زور	۱۹۵۰ء
انتخاب خطوط غالب	عبادت و مشرف	۱۹۶۰ء
خطوط غالب	مالک رام	۱۹۶۲ء
خطوط غالب	غلام رسول مہر	۱۹۶۲ء
غالب نکات و رقعات	اکبر علی خاں	۱۹۶۲ء
جان غالب	شمس علوی	۱۹۶۶ء

(غالب نمبر فکر و فن دہلی)

ضمیمہ

غالب اور سرور	ایم۔ حبیب خاں
غالب و تفتہ	ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری
حبسیۂ غالب	ڈاکٹر سعادت علی صدیقی

مصنف ایک نظر میں

نام : سعادت علی صدیقی

ولدیت : ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

پیدائش : لکھنؤ : ۱۵ مارچ ۱۹۴۵ء

تعلیم : بی اے۔ آنرس۔ لکھنؤ یونیورسٹی ۱۹۶۴ء فرسٹ ڈویژن

ایم اے۔ اسپیشل (اردو) لکھنؤ یونیورسٹی ۱۹۶۵ء فرسٹ پوزیشن

ایم لٹ (اردو) دہلی یونیورسٹی ۱۹۶۸ء فرسٹ ڈویژن

پی ایچ ڈی (اردو) لکھنؤ یونیورسٹی ۱۹۸۳ء

پیشہ : درس و تدریس (سربراہ شعبہ اردو، مہاتما گاندھی کالج سنبھل) ۷۱ء سے

مشاغل : خدمت اردو : چیرمین یو پی اردو تعلیمی جائزہ کمیٹی مراد آباد ۷۶ء سے

صدر عاشق پبلک لائبریری سنبھل یو پی ۷۶ء سے

خصوصی رکن اتر پردیش سرکار اردو تعلیمی مشاورتی بورڈ ۸۶ء سے

رکن ادارہ ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ ۷۰ء سے

تصانیف :

۱ حبسیۂ غالب (اردو اکادمی سے انعام یافتہ) ۱۹۷۱ء

۲ ادبی جائزے " " " ۱۹۷۵ء

۳ ادبی آئینے " " " ۱۹۸۳ء

۴ حدیث محبت (انتخاب کلام فرخ نگینوی) ۱۹۸۳ء

۵ چند ممتاز شعرائے سنبھل جلد اول ۱۹۸۴ء

۶ آئینہ نثر اردو (برائے ڈگری درجات) ۱۹۶۵ء

۷ بچوں کی لوک کہانیاں ۱۹۷۰ء

۸ وہ جب یاد آئے (خاکے) ۱۹۸۳ء

۹ انتخاب کلام باغ سنبھلی ۱۹۸۹ء

۱۰ شرح ادب پارے (برائے انٹرمیڈیٹ) ۱۹۶۵ء

ISBN 81 - 7160 - 017 - 4